الرسالة

Al-Risala

August 1999 • No. 273 • Rs. 9

سوچے سمجھے بغیر اقدام کرنا ایسا ہی ہے
جیسے آنکھیں بند کر کے کانٹوں اور پتھروں سے
بھرے ہوئے راستہ میں گھس پڑنا۔

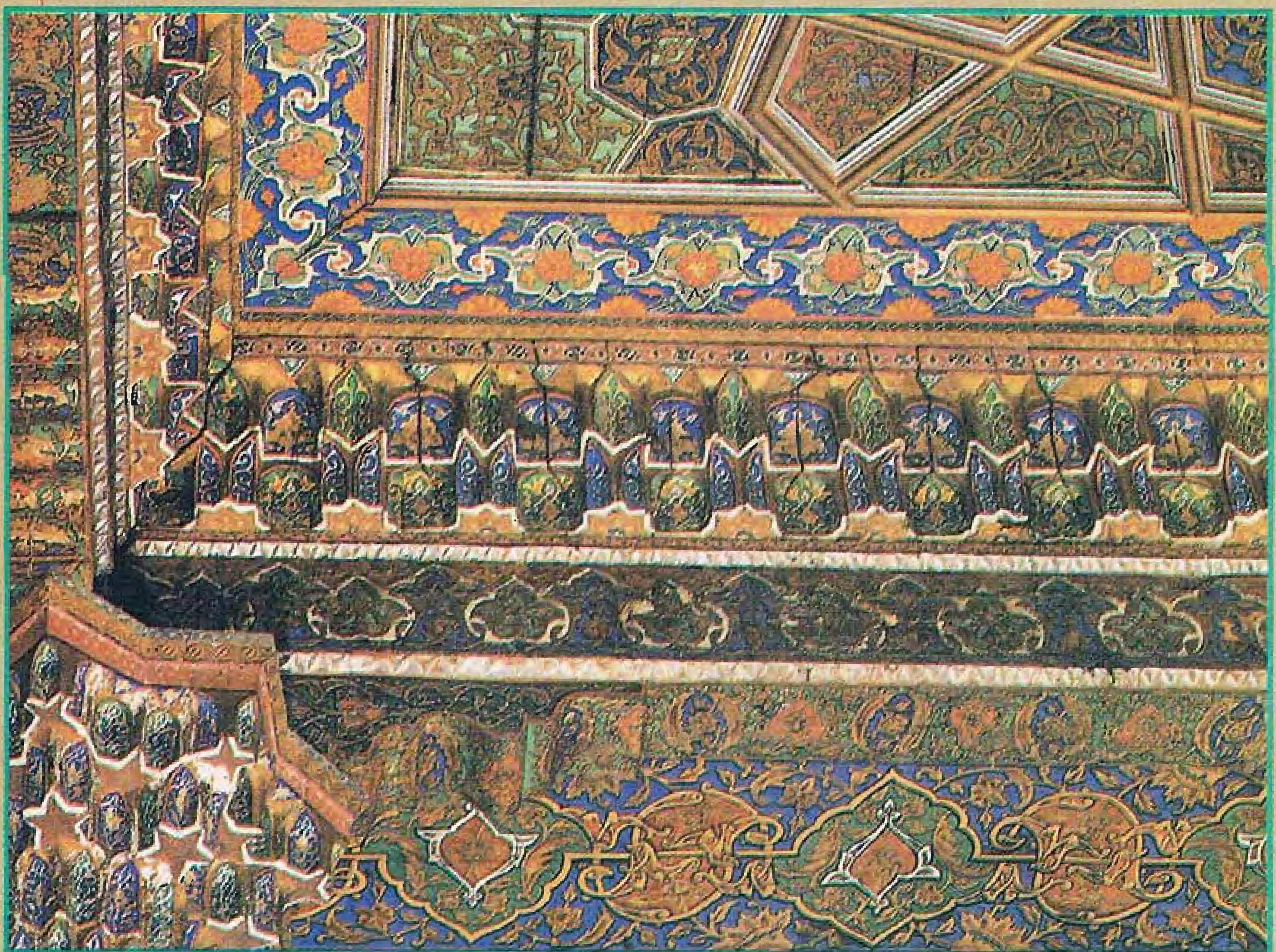

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	40.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	50.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروان ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	80.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	5.00
تاریخ دعوت حق	5.00

مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نثری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	50.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازدواج	7.00
ہندستانی مسلمان	50.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعہ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Al-Risala

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

خصوصی شمارہ: آیئنہ

فہرست

خدائی قانون 4
بگاڑ کا دور 7
گروہی صداقت 8
ناحق مال کھانا 10
غیر شرعی بنیاد 12
تحریف کتاب 15
فرضی کریڈٹ 17
خدا کی رحمت سے دوری 19
فرضی عقیدہ 21
سنت الٰہی 24
بعد کی نسلیں 26
اکابر پرستی 27
کتاب کو پس پشت ڈالنا 29
قول بلا فعل 32
اشاعت فاحشہ 34
حامل کتاب 36
فتنۂ امت 38
اضاعتِ صلاۃ 41
تحاکم الی الطاغوت 43
قساوتِ قلب 45
قانونِ فطرت 48

خدائی قانون

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں اہل اسلام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ---اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے ان کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہے۔ نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو کوئی بھی برا کرے گا اس کا بدلہ پائے گا۔ اور وہ نہ پائے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔ اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا (النساء ۱۲۲۔ ۱۲۴)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح ونجات کا خدائی قانون ایک ہی قانون ہے۔ مسلمان اور غیر مسلمان دونوں اسی قانون کے ماتحت ہیں۔ جو اس خدائی معیار پر پورا اترے گا اس کے لئے کامیابی ہے اور جو اس معیار پر پورا نہ اترے اس کے لئے ناکامی۔ کسی گروہ سے نسلی تعلق کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں۔

نجات کی یہ بنیاد دو چیزوں پر قائم ہے، ایمان اور عمل صالح۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ نجات کا انحصار تمام تر کچھ صفات پر ہے نہ کہ کسی گروہ سے نسلی تعلق پر۔

اس سلسلہ میں پہلی مطلوب صفت اللہ پر ایمان ہے۔ ایمان سے مراد کچھ الفاظ کو زبان سے بول دینا نہیں بلکہ اس سے مراد معرفت اور یقین کی وہ حالت ہے جب کہ آدمی خدا کے وجود کو اس طرح دریافت کرے کہ وہی اس کے لئے سب سے بڑی حقیقت بن جائے۔ خدا اس کی یادوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہو۔ خدا کی عظمت کا احساس اس کو ہلا دے۔ خدا کے انعامات کا تصور اس کے اندر شکر کا چشمہ جاری کر دے۔ وہ سب سے زیادہ خدا سے

ڈرے اور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرے۔ خدا کی ذات ہی اس کی سوچ اور اس کے جذبات کا مرکز و محور بن جائے۔

اس قسم کا ایمان جب کسی کے اندر پیدا ہوتا ہے تو اس کی عملی زندگی بھی اس کے مطابق تشکیل پانے لگتی ہے۔ اس کی روزمرہ کی زندگی کا نقشہ بھی اس کی اسی اندرونی تڑپ کے مطابق بننا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام عمل صالح ہے۔ صحیح فکر لازمی طور پر صحیح عمل پیدا کرتی ہے۔ فکر اور عمل کے درمیان اسی مطابقت کا شرعی نام عمل صالح ہے۔

اس عمل صالح کا تعلق زندگی کے ان تمام معاملات سے ہے جس سے آدمی کا سابقہ پیش آئے۔ آدمی جب بولے تو اس کا ہر بول اسی ایمان کی خوشبو میں بسا ہوا ہو۔ جب وہ کسی سے معاملہ کرے تو اس کے ہر معاملہ میں اسی ایمان کا رنگ دکھائی دے۔ جب کسی کے ساتھ اختلاف یا نزاع پیش آئے تو یہاں بھی اس کا ایمان اس کے لئے رہنما بن جائے۔ وہ لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ اس کی محبت اور نفرت، اس کی دوستی اور دشمنی، اس کا جڑنا اور اس کا کٹنا، سب اس کے ایمان کے تابع بن جائے۔ یہی عمل صالح ہے، اور اس عمل صالح کے بغیر کسی کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔

امت کے افراد میں جب زندہ شعور موجود ہو، تو وہ اسی معنی میں صاحب ایمان ہوتے ہیں اور اسی معنی میں صاحب عمل بھی۔ مگر جب امت پر دور زوال آتا ہے تو اس کے افراد میں اس قسم کا زندہ ایمان اور زندہ عمل باقی نہیں رہتا۔ وہ اب بھی ایمان اور عمل صالح کا نام لیتے ہیں مگر اس کی حقیقی اسپرٹ ان کے یہاں پائی نہیں جاتی۔ ان کے یہاں الفاظ ہوتے ہیں مگر وہ معانی سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں بظاہر عمل ہوتا ہے مگر حقیقی روح کے بغیر۔

تنزل کے اس دور میں جو خرابی پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ لوگ امانی پر جینے لگتے ہیں۔ امانی

کی تشریح اس روایت سے ہوتی ہے جس کو اس آیت کا سبب نزول بتایا گیا ہے۔ روایت کے مطابق، یہود و نصاری نے کہا کہ جنت میں صرف وہ شخص جائے گا جو ہمارے گروہ سے ہو (قالت الیھود والنصاری لن یدخل الجنة الا من کا ن منا) اس پر یہ آیت اتری۔

ایک اور روایت کے مطابق مسلمانوں نے اور اہل کتاب نے ایک دوسرے پر فخر کیا۔ اہل کتاب نے کہا کہ ہمارا پیغمبر تمہارے پیغمبر سے پہلے ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے۔ پس ہم تمہارے مقابلہ میں اللہ کے یہاں زیادہ حق دار ہیں۔ اور مسلمانوں نے کہا کہ ہمارا نبی آخری نبی ہے۔ اور ہماری کتاب دوسری تمام کتابوں پر فیصلہ کرنے والی ہے۔ اس پر یہ آیت اتری (تفاخر المؤمنون واھل الکتاب فقال اھل الکتاب :نبینا قبل نبیکم وکتابنا قبل کتابکم ونحن احق باللہ منکم وقال المؤمنون نبینا خاتم النبیین وکتابنا یقضی علی سائر الکتب فنزلت الایة) تفسیر القرطبی ۵/۳۹۶

اس روایت سے امانی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے بجائے آرزوؤں اور خوش فہمیوں پر نجات کی بنیاد رکھ لینا۔ اس کی ایک صورت فخر ہے یعنی ذاتی صفات کے بجائے کچھ ظاہری چیزوں کو بنیاد بنانا اور اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لینا۔

کون شریعت پہلے آئی اور کون شریعت بعد کو آئی، یہ خدا کے یہاں افضلیت کی بنیاد نہیں۔ اسی طرح یہ بھی اصل اہمیت کی چیز نہیں کہ کون اس رسولؐ کے نام پر بننے والے گروہ سے وابستہ تھا اور کون اُس رسول کے نام پر بننے والے گروہ سے۔ اسی طرح یہ بھی فیصلہ کی بنیاد نہیں کہ کس کا دین افضل ہے اور کس کا دین غیر افضل۔ یہ سب خدا کے

نزدیک غیر متعلق باتیں ہیں۔ خدا ہر ایک کو اس کی ذاتی صفات کے اعتبار سے جانچے گا نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔

بگاڑ کا دور

حضرت ابو سعید کہتے ہیں۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم ضرور اتباع کرو گے ان لوگوں کی جو تم سے پہلے تھے، بالشت برابر بالشت اور ہاتھ برابر ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کی بل میں داخل ہوئے ہیں تو تم بھی اس میں داخل ہو جاؤ گے۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول کیا وہ یہود و نصاری ہیں۔ آپ نے جواب دیا اور کون (لتتبعن سنن من قبلكم شبرا بشبر وذراعا بذراع حتى لو دخلوا جحر ضب تبعتموهم قيل يارسول الله اليهود والنصارى قال فمن) متفق عليه، بحواله مشكاة المصابيح ١٤٧٣/٣

یہ حدیث ایک اعتبار سے پیشین گوئی ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ نصیحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلی امتیں زوال کے جس قانون کی زد میں آئیں، امت مسلمہ اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس امت کے بعد کی نسلوں میں بھی وہی تمام بگاڑ لازمی طور پر پیدا ہوں گے جو پچھلی امتوں کی بعد کی نسلوں میں پیدا ہوئے۔

یہ بگاڑ کیا ہے۔ وہ بگاڑ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر شعوری ایمان کے بجائے نسلی ایمان پیدا ہو جائے۔ افراد امت میں دینی حساسیت باقی نہ رہے، اس کے بجائے لوگ دینی بے حسی میں جینے لگیں۔ دینی مظاہر تو ان کے درمیان دکھائی دیں مگر ان کے درمیان دینی اسپرٹ کا فقدان ہو چکا ہو۔ ان کا دین قومی دین ہو نہ کہ وہ دین جو خوف خدا کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ وہ آخرت کا نام لیتے ہوں مگر ان کی توجہات کا مرکز صرف دنیا کے مفادات بنے ہوئے ہوں۔ وہ عملاً غیر دینی

سرگرمیوں میں مشغول ہوں مگر انہوں نے ان غیر دینی سرگرمیوں پر دین کا لیبل لگا رکھا ہو۔

جب امت پر یہ وقت آجائے تو اس وقت اس کی اصلاح نو کی ضمانت یہ ہے کہ اس کے درمیان صحیح قسم کے مصلحین پیدا ہوں، ایسے مصلحین جو ازسرنو ان کے اندر صحیح دینی بیداری پیدا کریں۔ وہ ان کی پسندیدہ خوراک دینے کے بجائے انہیں نصیحت کریں۔ وہ ان کے عیوب بتا کر انہیں اپنی اصلاح پر ابھاریں۔ وہ انہیں جھنجھوڑیں نہ کہ لوریاں سنا کر ان کو دوبارہ سلادیں۔

امت مسلمہ اپنے بعد کے زمانے میں یہود و نصاریٰ کی پیروی کرے گی...... اس سے مراد صرف شکلی تقلید نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ باعتبار شکل انہوں نے بگاڑ کے جو جو کام کئے ہیں ان کو امت مسلمہ کے لوگ بھی اسی طرح دہرائیں گے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی بگڑا مزاج امت مسلمہ کے لوگوں میں بھی پیدا ہو جائے گا اس لئے وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہی سب کام کرنے لگیں گے جو یہود و نصاریٰ نے اپنے دور زوال میں کیا۔

اصل یہ ہے کہ امت کی ابتدائی نسل میں خدا کا دین اپنی اصولی حیثیت میں ہوتا ہے۔ بعد کے زمانے میں وہ اصولی مذہب کے مقام سے گزر کر قومی مذہب کی سطح پر آجاتا ہے۔ اس کے بعد مختلف قسم کے جو بگاڑ آتے ہیں وہ سب اسی قومی مذہب کے مظاہر ہوتے ہیں۔ اصولی مذہب اصولی کردار پیدا کرتا ہے اور قومی مذہب قومی کردار۔

گروہی صداقت

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ ــــ اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کسی چیز پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ یہود کسی چیز پر نہیں اور وہ سب آسمانی کتاب پڑھتے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں نے کہا جن کے پاس علم نہیں، انہیں کے جیسا قول۔ پس اللہ قیامت کے دن اس بات کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ جھگڑ رہے تھے (البقرہ ۱۱۳)

قرآن کی اس آیت میں زوال یافتہ امت کی اس خرابی کا ذکر کیا گیا ہے جس کو گروہی صداقت کہا جاسکتا ہے۔ دور زوال میں ایسا ہوتا ہے کہ امت بہت سے گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ اس کا ہر گروہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ صرف میرا گروہ حق پر ہے اور دوسرے تمام گروہ باطل پر۔ باعتبار حقیقت، ان میں سے ہر ایک کا دین گروہ پرستی ہوتا ہے مگر بطور خود ہر گروہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو حق پرستی پر قائم کر رکھا ہے۔

اس اختلاف کا سبب کیا ہے۔ اصل یہی ہے کہ امت پر جب زوال کا دور آتا ہے تو خدا کی رسی لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ اب وہ خدا کو چھوڑ کر کسی نہ کسی غیر خدا کو اپنی توجہات کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ یہی چیز اختلافات کا اصل سبب ہے۔ اگر لوگ خدا کی رسی پکڑے ہوئے ہوں تو چونکہ خدا ایک ہے اس لئے ان کی جماعت بھی ایک بنے گی۔ مگر جب خدا کے بجائے دوسری چیزیں لوگوں کی عقیدہ اور توجہ کا مرکز بن جائیں تو چونکہ چیزیں متعدد ہیں اس لئے ان کی جماعتیں بھی متعدد ہو جائیں گی۔

ایک خدا کے ساتھ اعتصام امت کو ایک واحد گروہ بناتا ہے۔ اس کے برعکس جب لوگوں کا تعلق خدا سے کمزور ہو جائے تو ہر طبقہ اپنے حالات کے لحاظ سے الگ الگ مرکز عقیدت بنا لے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امت کی وحدت کمزور ہو جائے گی اور اس کے افراد مختلف گروہوں میں بٹ کر منتشر اور منقسم ہو جائیں گے۔

اس معاملہ کی نسبت سے انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو سچائی کو خدا کی نسبت سے پہچانے۔ اور دوسرے وہ جو سچائی کو اپنے گروہ کی نسبت سے پہچانے۔ خدا کے نزدیک پہلا

گروہ ہدایت پر ہے اور دوسرا گروہ ضلالت پر۔

خدا کو سچائی کی نسبت سے پہچاننے والے وہ لوگ ہیں جو حق کو ماننے کے لئے صرف اس بات کو کافی سمجھیں کہ اس کے حق میں خدا کی دلیل موجود ہو۔ خدا کی دلیل سامنے آنے کے بعد اس کا اعتراف کرنے کے لئے انہیں کسی اور چیز کی ضرورت نہ ہو۔

اس کے برعکس حال ان لوگوں کا ہوتا ہے جو سچائی کو صرف اپنے گروہ کی نسبت سے پہچانتے ہوں۔ ان کے نزدیک حق صرف وہ ہوتا ہے جو ان کے گروہی مسلک کے مطابق ہو، جس کے حق میں ان کے گروہی بزرگوں کا قول موجود ہو، جس کی تائید ان کی گروہی کتابوں سے ہو رہی ہو۔ جس چیز کے حق میں یہ گروہی شہادتیں نہ پائی جائیں اس کی حقانیت پر یقین کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا، خواہ اس کے حق میں کتنی ہی زیادہ خدائی دلیلیں دے دی گئی ہوں۔

ان دونوں جماعتوں میں پہلی جماعت خدا پرست ہے اور دوسری جماعت گروہ پرست، خواہ وہ بطور خود اپنے آپ کو خدا پرست کیوں نہ بتا رہی ہو۔

ناحق مال کھانا

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ایک حکم اس طرح آیا ہے۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طور پر نہ کھاؤ اور اپنے مال کے مقدمہ کو اس لئے حاکموں کے پاس نہ لے جاؤ تاکہ تم دوسروں کے مال کا کوئی حصہ باطل طریقہ سے کھا جاؤ۔ حالاں کہ تم اس کو جانتے ہو (البقرہ ۱۸۸)

نزول قرآن کے زمانہ میں مدینہ کے بعض مسلمانوں سے ایک کمزوری ظاہر ہوئی۔ اس کے بعد قرآن میں یہ ہدایت اتاری گئی۔ یہ آیت خصوصی طور پر بعد کے مسلمانوں کے لئے بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، بعد کی مسلم نسلوں میں یہ خرابی عمومی طور پر پیدا ہو جائے گی جو کہ دور اول میں صرف جزئی طور پر ظاہر ہوئی تھی۔

اس آیت میں مال وجائداد کے ایسے نزاعی معاملات کا ذکر ہے جن میں آدمی کو معلوم ہو

کہ انصاف کی رو سے وہ اس کا حقدار نہیں۔ زیر نزاع جائداد یا مال حقیقۃً اس کے بھائی کا ہے نہ کہ اس کا۔ لیکن اس ذاتی علم کے باوجود وہ اپنے مقدمہ کو انسانی عدالت میں لے جائے۔ جس چیز کو وہ اپنے ضمیر کی عدالت سے بجا طور پر نہیں پا سکتا تھا اس کو خارجی عدالت کے ذریعہ بے جا طور پر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

انسانی حاکم کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ظاہر کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے۔ وہ مقدمہ کے الفاظ کو دیکھتا ہے نہ کہ اس کی اصل حقیقت کو۔ اس لئے یہاں یہ موقع ہوتا ہے کہ اپنے مقدمہ کی ایسی لفظی تصویر بنائی جائے جو حاکم یا جج کو گمراہ کردے۔ وہ ظاہری الفاظ کی بنیاد پر ایسا فیصلہ دے دے جو حقیقت واقعہ سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔

جب لوگوں کے دلوں میں آخرت کی پکڑ کا خوف ہو تو وہ مال اور جائداد کے ایسے مقدمات عدالت میں نہیں لے جائیں گے جن کی بابت ان کا دل پیشگی طور پر یہ کہہ رہا ہو کہ یہ میرا حق نہیں ہے۔ مگر جب دلوں میں آخرت کا خوف نہ رہے تو ذاتی مفادات ہی لوگوں کے رہنما بن جاتے ہیں۔ وہ بے تکلف ایسے معاملات کو لے کر انسانی عدالت میں پہنچ جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ مقدمہ کو عدالت کے سامنے ایسے پر فریب الفاظ میں پیش کرسکیں گے جن سے متاثر ہو کر وہ ایک ایسی چیز انہیں دے دے جو از روئے حق ان کی نہیں ہے۔

ضمیر کی عدالت کے سامنے جھک جانا اس بات کی علامت ہے کہ امت زندہ دین پر قائم ہے اور جب لوگ ضمیر کی عدالت کو نظر انداز کر کے اپنے مقدمات انسانی عدالتوں میں لے جانے لگیں تو سمجھنا چاہیے کہ امت اپنے دور زوال میں پہنچ گئی۔

ایک شخص جس کے سینہ میں اللہ کا ڈر ہو، جو آخرت کی پکڑ کا اندیشہ رکھتا ہو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ عدالت میں صرف اپنا جائز حق لینے کے لئے جاتا ہے، نہ کہ عدالت کی طاقت سے دوسروں کے حق پر اپنا قبضہ قائم کرنے کے لئے۔ عدالت کے زور پر ایک ایسی

چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا جرم ہے جو حقیقی معنوں میں اس کی نہ ہو۔ جو آدمی آخرت کی پکڑ سے ڈرتا ہو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک چیز اس کے قبضہ میں ہو مگر اس کا دل کہہ رہا ہو کہ وہ اس کی نہیں ہے تو عدالتی فیصلہ کا انتظار کئے بغیر وہ ایسی چیز کو اصل حقدار کے حوالہ کر دے گا۔ کیونکہ اس کو یقین ہوگا کہ جو چیز از روئے واقعہ میری نہیں وہ کسی انسانی عدالت کے فیصلہ کی بنا پر میری نہیں ہو سکتی، خواہ وہ عدالت کتنی زیادہ بڑی کیوں نہ ہو۔

غیر شرعی بنیاد

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ ــــ اور تم آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طور پر نہ کھاؤ اور ان کو حاکموں تک نہ پہنچاؤ تاکہ دوسروں کے مال کا کوئی حصہ تم حق تلفی کر کے کھا جاؤ۔ حالاں کہ تم اس کو جانتے ہو (البقرۃ ۱۸۸)

اس سے مراد وہ صورت حال ہے جب کہ ایک چیز جو شرعی قانون کے تحت نہ مل سکتی ہو اس کو غیر شرعی قانون کے زور پر حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایک ایسا مال یا ایک ایسی جائداد جس کے متعلق معلوم ہو کہ شریعت الٰہی کے مطابق وہ تمہارا حق نہیں ہے اس کو غلط تدبیر کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ایسا نہ کرو کہ ایسے مال اور جائداد کے معاملہ کو دنیوی عدالت میں لے جاؤ اور اس کے زور پر وہ چیز حاصل کرنے کی تدبیر کرو جو از روئے شریعت تمہاری نہیں ہے۔

جب بھی کسی مال یا جائداد کا مسئلہ پیدا ہو تو عام حالات میں انسان کا ضمیر ہی یہ بتانے کے لئے کافی ہوتا ہے کہ از روئے واقعہ وہ کس کا حق ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق معاملہ کرے۔ جو اس کا حق ہے اس کو اپنے پاس رکھے اور جو

دوسرے کا حق ہے اس کو دوسرے کے حوالے کردے۔

تاہم بعض حالات میں ضمیر کی رہنمائی واضح نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں آدمی کو چاہئے کہ شریعت کے معلوم قوانین کی روشنی میں اس کو جانچے اور شریعت کے ذریعہ جو فیصلہ مل رہا ہو اس کو خدائی فیصلہ سمجھ کر اسی پر راضی ہو جائے۔ اگر معاملہ دو فریق کے درمیان نزاعی ہو اور بطور خود اس کا فیصلہ نہ کیا جا سکتا ہو تو دونوں فریقوں کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ کو شرعی عدالت میں لے جائیں۔ اگر باضابطہ شرعی عدالت کا نظام قائم نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ اس معاملہ میں علماء اسلام کی طرف رجوع کیا جائے اور یہ علماء اپنے شرعی علم کے مطابق جو فیصلہ دیں اس کو بلا بحث مان لیا جائے۔

نزاعی معاملات میں یہی طریقہ خدا کا مطلوب طریقہ ہے۔ جو لوگ ایسا کریں کہ وہ اپنا مقدمہ غیر شرعی عدالتوں میں لے جائیں، جو مال یا جائداد انہیں شرعی قانون کے تحت نہیں مل سکتا تھا اس کو غیر شرعی عدالت کے زور پر حاصل کرنے کی کوشش کریں وہ بلاشبہ خدا کی نظر میں سرکشی کے مجرم ہیں۔ ایسا کرنے والے لوگ بیک وقت اپنے لئے دو خطرہ مول لے رہے ہیں۔ ایک یہ کہ غیر شرعی عدالت کے زور پر اپنے حق میں فیصلہ لینے کے باوجود زیر بحث معاملہ میں ان کی حیثیت خدا کے نزدیک غاصب کی رہے گی نہ کہ مالک کی۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد جب وہ خدا کی برتر عدالت میں پہنچیں تو وہاں ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو خدا کے نافرمانوں کے لئے مقدر ہے۔

موجودہ زمانہ میں بھی اکثر ملکوں (مثلاً ہندستان) میں تقریباً یہی صورت حال قائم ہے یعنی ہر ملک میں بیک وقت دو مختلف قسم کے فیصلے حاصل کرنے کے انتظامات ہیں ایک طرف علمائے دین ہیں، جو لوگ اپنے مسائل میں ان علماء سے رجوع کریں، وہ شریعت کی

روشنی میں ان کے معاملات کا فیصلہ دیں گے۔ دوسری طرف ملکی عدالتیں ہیں جہاں انسانی ساخت کے قوانین رائج ہیں، جہاں وکیلوں کو بڑی بڑی فیس دے کر ان کے ذریعہ غلط طور پر اپنے موافق فیصلے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

اس طرح دنیا کے اکثر ملکوں میں مسلمان دوبارہ اسی آزمائش میں مبتلا ہیں جس آزمائش میں مدینہ کے دور اوّل کے مسلمان مبتلا تھے۔ اب جو مسلمان ایسا کریں کہ جب بھی ان کے درمیان کوئی نزاع پیش آئے خواہ وہ نکاح وطلاق کا معاملہ ہو یا مال اور جائداد کا معاملہ، وہ اس کا فیصلہ خدائی شریعت سے کرائیں، یعنی وہ اپنے اس طرح کے معاملات کو دینی علماء (یا دارالافتاء اور دارالقضاء) کے پاس لے جائیں۔ معاملہ کے دونوں فریق اپنا اپنا نقطۂ نظر علماء کے سامنے بیان کریں۔ اس کے بعد وہ شریعت کی روشنی میں جو فیصلہ دیں اس کو دونوں فریق پوری طرح مان لیں۔ اس کے بعد نہ وہ اپنی نزاع کو دوبارہ جاری رکھیں اور نہ ایسا کریں کہ جس فریق کے خلاف فیصلہ ہوا ہو وہ اس کو لے کر ملکی عدالت تک پہنچ جائے اور دوبارہ وہاں ازسرنو اس کے خلاف مقدمہ شروع کرادے۔

اس کے برعکس جو مسلمان اپنے نزاعی معاملات کو علماء کے پاس نہ لائیں بلکہ وہ اس کو ملکی عدالتوں میں لے جاکر ہر قیمت پر اپنے حق میں فیصلہ لینے کی کوشش کریں۔ ایسے لوگ بلاشبہ مذکورہ آیت کا مصداق ہیں۔ وہ خدا اور رسول کو چھوڑ کر شیطان (طاغوت) کے پاس جارہے ہیں۔

یہ صورت حال تمام مسلمانوں کے لئے ایک سنگین آزمائش ہے۔ جو لوگ اپنے نزاعی معاملات کا فیصلہ خدائی شریعت کے مطابق لیں اور برضا ورغبت اس کو قبول کرلیں، وہ اس آزمائش میں پورے اترے۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں مخلص مسلمان ثابت ہوں گے

اور خدائی انعامات کے مستحق قرار پائیں گے۔

اس کے برعکس جو لوگ ایسے معاملات میں خدائی شریعت کو نظر انداز کر دیں، اور مفاد پرستی اور خود غرضی کے جذبہ کے تحت اپنا مقدمہ ان عدالتوں میں لے جائیں جن کے متعلق ہندستان کے ایک ماہر قانون نے بجا طور پر کہا ہے کہ یہ عدالتیں مبنی بر مقدمہ بازی (litigation-based) ہیں نہ کہ مبنی بر صداقت (truth-based)۔ ایسے لوگ بلاشبہ اسی مجرمانہ ذہنیت کے شکار ہیں جس کا ذکر اوپر کی آیت میں آیا ہے ان عدالتوں کے متعلق معلوم ہے کہ وہاں انصاف کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ وہاں معاملات کا فیصلہ قانونی نکتوں پر ہوتا ہے نہ کہ حقیقی واقعات پر۔ اب جو لوگ ایسا کریں کہ وہ خدائی شریعت کے مطابق فیصلہ لینے کے لئے تیار نہ ہوں۔ بلکہ مذکورہ قسم کی عدالتوں میں اپنے معاملات لے جائیں وہ بلاشبہ اللہ کے پرستار نہیں، بلکہ وہ طاغوت کے پرستار ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے سخت اندیشہ ہے کہ وہ "نماز روزہ" کے باوجود خدا کے نزدیک مجرم قرار پائیں اور آخرت میں ان کا انجام وہ ہو جو غیر خدا کے پرستاروں کے لئے مقدر کیا گیا ہے۔

تحریف کتاب

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں یہود کے علماء کی بابت ارشاد ہوا ہے کہ پس خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ تھوڑی سی پونجی حاصل کر لیں۔ پس خرابی ہے اس چیز کی بدولت جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لئے خرابی ہے اپنی اس کمائی سے۔ (البقرہ۔۷۹)

کسی امت کے بعد کے لوگ جب زوال کا شکار ہوتے ہیں۔ تو ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ ظاہری عقیدہ کے اعتبار سے تو وہ خدا کی کتاب کو مانتے ہیں مگر ان کی عملی زندگی سر تا سر

کتاب الٰہی سے آزاد ہو جاتی ہے۔ وہ خدا کی کتاب کا زبانی اقرار کرنے کے باوجود اپنی زندگی کو پوری طرح خواہشات کے راستہ پر چلا دیتے ہیں۔

اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر، اب بھی وہ اپنے کو حق پرست ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خواہ وہ عملی اعتبار سے کتنا ہی زیادہ منحرف ہو جائیں مگر خدا پرست ہونے کا لیبل اب بھی ان کے اوپر لگا رہے۔ اس مقصد کے لئے وہ خدا کی کتاب کی ایسی خود ساختہ تفسیر و تعبیر کرنے لگتے ہیں جس کے تحت ان کی بگڑی ہوئی زندگی عین خدائی شریعت کے مطابق نظر آنے لگے۔

یہودی علماء نے خدا کی کتاب میں تحریف کا یہ کام بہت بڑے پیمانے پر کیا۔ انھوں نے اپنے فاسد خیالات اور غلط کردار کو درست ثابت کرنے کے لئے خدا کی کتاب میں تحریفات کر کے اس کو اپنے مطابق ڈھال لیا۔ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، یہی فعل بعد کے حامل کتاب بھی انجام دیں گے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہود نے کتاب کے متن میں تحریفات کیں اور بعد کے لوگ متن کی تشریح میں یہی کام انجام دیں گے۔

غلط روی ایک عام انسانی کمزوری ہے۔ مگر جب کوئی حامل کتاب گروہ غلط روی کا شکار ہو جائے تو وہ اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کرے وہی خدا کی کتاب میں بھی لکھا ہوا ہو۔ اس قسم کی خود ساختہ تفسیر و تشریح بلاشبہ بہت بڑا جرم ہے۔ مگر جب زوال کا دور آتا ہے تو وہ اپنے ساتھ بے حسی بھی ضرور لے آتا ہے۔ اب لوگ خدائی معاملات میں زیادہ حساس نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ دور زوال میں حسب حال دینی تشریحات عام ہو جاتی ہیں۔ لوگ دنیا کے فائدہ کی خاطر دین کو بدل ڈالتے ہیں۔

تحریف کا یہ معاملہ ہمیشہ دور زوال میں پیش آتا ہے جب کسی حامل کتاب پر زوال

آتا ہے تو وہ اس معنی میں نہیں ہوتا کہ وہ علانیہ طور پر دین سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ ہمیشہ اس معنی میں ہوتا ہے کہ لوگ بظاہر تو دین سے وابستگی کا اعلان کرتے ہیں مگر ان کا سرکش مزاج یا ان کی خود غرضانہ نفسیات دین کے تابع بننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ یہی وہ وقت ہے جب کہ ان کے درمیان وہ عمل شروع ہو جاتا ہے جس کو قرآن میں تحریف کہا گیا ہے۔ اب وہ لوگ یہ کرتے ہیں کہ خدا کے کلام کو بدل کر یا اس کی خود ساختہ تشریح کر کے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہی خود خدا کے دین کا تقاضا بھی ہے۔ یہ گویا بے عملی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ بے عملی خدا کے یہاں معاف ہو سکتی ہے مگر سرکشی یقینی طور پر قابل معافی نہیں۔

فرضی کریڈٹ

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں اہل کتاب کے بارے میں ارشاد ہوا ہے ---- جو لوگ اپنے کئے ہوئے پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کیا اس پر ان کی تعریف ہو، ان کو عذاب سے بری نہ سمجھو۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے (آل عمران۔ ۱۸۸)

آسمانی کتاب کے حامل کسی گروہ پر زوال آتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ وہ خدا اور رسول کا نام لینا چھوڑ دے یا خدا کی کتاب سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دے۔ دین ایسے گروہ کی نسلی روایات میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا پر فخر قومی اثاثہ بن جاتا ہے۔ اور جس چیز سے اس طرح کا نسلی اور قومی تعلق قائم ہو جائے اس سے علیحدگی کسی گروہ کے لئے ممکن نہیں ہوتی۔ تاہم اس کا یہ تعلق محض رسمی تعلق ہوتا ہے نہ کہ فی الواقع کوئی حقیقی تعلق۔

وہ اپنی دنیوی سرگرمیاں بھی دین کے نام پر جاری کرتے ہیں، وہ بے دین ہو کر بھی اپنے کو دیندار کہلانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ ان کو اس کا کریڈیٹ دیا جائے جس کو

انھوں نے کیا ہی نہیں۔ وہ نجات اخروی سے بے فکر ہو کر زندگی گزارتے ہیں اور اسی کے ساتھ ایسے عقیدے بنا لیتے ہیں جس کے مطابق ان کو اپنی نجات آخرت بالکل محفوظ نظر آتی ہے۔ وہ اپنے خود ساختہ دین پر چلتے ہیں مگر وہ اپنے کو دین خداوندی کا علم بردار بتاتے ہیں۔ وہ دنیوی مقاصد کے لئے سرگرم ہوتے ہیں اور اپنی سرگرمیوں کو آخرت کا عنوان دیتے ہیں۔ وہ خود ساختہ سیاست چلاتے ہیں اور اس کو خدائی سیاست ثابت کرتے ہیں۔ وہ قومی مفادات کے لئے اٹھتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ وہ خیر امت کا کردار ادا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔

مگر کوئی شخص بے دینی کو دین کہنے لگے تو اس بنا پر وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا ...... آدمی دنیا کی طرف دوڑے اور آخرت سے بے پرواہ ہو جائے تو یہ صرف گمراہی ہے اور اگر وہ اپنے دنیوی کاروبار کو خدا اور رسول کے نام پر کرنے لگے تو یہ گمراہی پر سرکشی کا اضافہ ہے۔ کیوں کہ یہ ایسے کام پر انعام چاہنا ہے جس کو آدمی نے انجام ہی نہیں دیا۔ یہی حال امت مسلمہ کے افراد کا بھی اس وقت ہو جاتا ہے جب کہ امت اپنے دور زوال میں پہنچ چکی ہو۔

امت کے افراد میں زندہ ایمان موجود ہو تو ان کی حساسیت پوری طرح بیدار رہتی ہے ان کی یہ حساسیت اس میں رکاوٹ بن جاتی ہے کہ وہ ایسے کام کا کریڈیٹ لینا چاہیں جس کو حقیقی اعتبار سے انھوں نے انجام ہی نہیں دیا مگر جب قوم پر زوال آتا ہے تو اس میں یہ حساسیت زندہ نہیں رہتی۔ اب ان کے افراد بے حسی کا شکار ہو جاتے ہیں یہی بے حسی وہ چیز ہے جو انھیں آمادہ کرتی ہے کہ وہ ایسے عمل کا انعام لینے کے لئے دوڑ پڑے جس کو از روئے واقعہ انھوں نے انجام ہی نہ دیا ہو۔

خدا کی رحمت سے دوری

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ...... بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی داؤد اور عیسی بن مریم کی زبان سے۔ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ نہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔ (المائدہ۔۷۹)

لعنت کے معنی عربی زبان میں رحمت اور خیر سے دور کرنے کے ہیں (الابعاد والطرد من الخیر ، لسان العرب) قرآن کی آیت بتاتی ہے کہ یہود جب دینی گراوٹ کا شکار ہوئے تو حضرت داؤد اور حضرت عیسی کے ذریعہ ان پر لعنت کی گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے آکر یہ کہا کہ اے یہود تم پر لعنت ہو۔ بلکہ انہوں نے یہ کیا کہ یہود کی چھپی ہوئی بے دینی کو ظاہر (expose) کر دیا۔ انہوں نے ان کی اصل حقیقت کو بے نقاب کر دیا۔

زوال کے دور میں کسی امت سے جو چیز رخصت ہوتی ہے وہ حقیقت دین ہے۔ جہاں تک رسوم و ظواہر کا تعلق ہے وہ اب بھی پوری دھوم کے ساتھ اس کے یہاں موجود رہتے ہیں۔ یہی حال یہود کا اپنے دور زوال میں ہوا۔ ان کے یہاں دین کی اصل حقیقت گم ہو چکی تھی مگر لباس، وضع قطع، ظاہری عبادات، دین کے نام پر نمائشی سرگرمیاں، اس قسم کی چیزیں ان کے یہاں دھوم کے ساتھ جاری تھیں۔ مگر دین کے جو حقیقی تقاضے ہیں وہ ان کے یہاں موجود نہ تھے۔ ان کے پیغمبر نے اس معاملہ کو طاقتور انداز میں بیان کر کے ان کی حقیقت کھول دی۔

اس آیت میں اس سلسلہ میں ایک بنیادی چیز کی نشان دہی کی گئی ہے، اور وہ ہے نہی عن المنکر کی اہمیت ۔ یہود جزئی اور ظاہری نوعیت کی چیزوں میں دین کی خوب نمائش کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ ان کا یہ حال تھا کہ معاشرہ میں وہ دیکھتے تھے کہ لوگ اخلاقی برائیاں کر رہے ہیں، لوگ ایک دوسرے کے ساتھ زیادتیاں کر رہے ہیں، لوگ معاملات میں خدائی احکام کو چھوڑے ہوئے ہیں مگر وہ دیکھنے اور جاننے کے باوجود چپ رہتے تھے۔ وہ برائی کرنے والوں کی مذمت نہیں کرتے تھے۔ یہی دو عملی ان کو رحمت خداوندی سے دور کرنے کا باعث بنی۔

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے اس سے اس معاملہ کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ اس کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل جب گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے ان کو ان گناہوں اور برائیوں سے روکا مگر وہ ان سے نہیں رکے۔ اس کے باوجود علماء ان کی مجلسوں میں بیٹھتے رہے۔ اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے رہے۔ پھر اللہ نے ایک کا اثر دوسرے پر ڈال دیا اور پھر داؤد اور عیسیٰ کی زبان سے ان پر لعنت کی۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم کو معروف کا حکم دینا ہوگا اور تمہیں منکر سے روکنا ہوگا اور تمہیں ظالم کا ہاتھ پکڑنا ہوگا تمہیں لوگوں کو حق کی طرف موڑنا ہوگا ورنہ اللہ تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح یہود پر لعنت کی (تفسیر ابن کثیر ۲/ ۸۳)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے مراد اصلاً کوئی حکومتی نظام نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ہر مسلمان، خصوصاً علماء کے اندر یہ اسپرٹ موجود ہو کہ وہ برائی کو کسی حال میں گوارہ نہ کریں۔ معاشرہ میں خیر کی نصیحت کا ماحول ہو۔ لوگوں میں

یہ عمومی مزاج ہو کہ وہ معاشرہ کے اندر برائی اور زیادتی کو کسی حال میں برداشت نہ کریں۔ جب بھی ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر کسی قسم کی زیادتی کرتا ہوا دکھائی دے تو پورا معاشرہ اس کو رد کر دے۔ ایسے مسلمان کو سمجھایا جائے۔ اگر سمجھانا کافی نہ ہو تو معاشرہ کے لوگ اس کی کھلی مذمت کریں۔ اس پر اتنا زیادہ معاشرتی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ اپنی غلط کاری کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔

مسلم معاشرہ میں برائی کی مذمت کرنا اور برائی کرنے والے کو روکنا اتنا زیادہ ضروری ہے کہ اگر کوئی مسلم معاشرہ اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو اس کیلئے اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی رحمت سے محروم کر دیا جائے، خواہ اس کے درمیان نمائشی مذہب پوری دھوم کے ساتھ موجود ہو۔

فرضی عقیدہ

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں یہود و نصاری کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور یہود و نصاری کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ تم کہو کہ پھر وہ تمہارے گناہوں پر تم کو سزا کیوں دیتا ہے۔ نہیں بلکہ تم بھی اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں سے ایک آدمی ہو۔ وہ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (المائدہ ۱۸)

دور زوال میں امت کے افراد میں جو غلط تصورات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اس بھرم میں پڑ جاتے ہیں کہ وہ دوسروں سے افضل ہیں۔ ان کا معاملہ خدا کے یہاں دوسروں سے مختلف ہو گا۔ دوسرے لوگ جن باتوں پر پکڑے جائیں گے اس پر ان کی

پکڑ ہونے والی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ امت جب خیر وصلاح کی حالت پر ہوتی ہے تو اس کو خدا کی طرف سے بشارتیں ملتی ہیں۔ اس کے افراد کے لئے رحمت ومغفرت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ وعدہ یا بشارت تمام تر ان کے حسن عمل کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ امت سے محض نسلی تعلق کی بنیاد پر۔ دور زوال میں لوگ اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔ وہ ان بشارتوں کو نسل اور وراثت سے متعلق سمجھ لیتے ہیں جو صرف کردار اور صالحیت سے تعلق رکھتی تھیں۔ فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کی یہی غلطی ہے جس کی بنا پر بعد کو آنے والے زوال یافتہ لوگ ایک ایسے انعام کو اپنا حصہ سمجھ لیتے ہیں جس کا استحقاق انہیں سرے سے حاصل ہی نہیں۔

خدا کے نزدیک ہر آدمی یکساں ہے۔ خدا ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان صرف کردار کی بنیاد پر فرق کرتا ہے نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔ امت کے افراد میں جب دین کا حقیقی شعور زندہ ہو تو کسی اشتباہ یا مغالطہ کے بغیر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا رب ان کے ساتھ دوسروں سے مختلف معاملہ صرف اس وقت کرے گا جب کہ ان کا حقیقی عمل دوسروں سے مختلف ہو۔ بصورت دیگر، خدا کے یہاں ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کے جیسے دوسرے انسانوں کا انجام ہونے والا ہے۔

لیکن امت جب اپنے دور زوال میں پہنچ جائے تو اس کے افراد حقائق کے بجائے خوش فہمیوں میں جینے لگتے ہیں۔ اس دور زوال میں امت کے افراد میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔

نسلی نجات یا گروہی نجات کا تصور قرآن وحدیث میں سراسر اجنبی ہے۔ خدا کی نظر میں تمام انسان یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ گروہ یا نسل جیسی چیزوں سے ایک انسان اور

دوسرے انسان میں فرق نہیں ہوتا۔ فرق کا سبب صرف ایک ہے اور وہ حقیقی عمل ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے قول و عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف ثابت کرے تو وہ خدا کی نظر میں مختلف انسان قرار پائے گا اور اس کا انجام دوسروں سے مختلف ہوگا۔

قرآن کی سورہ نمبر ۴۹ میں ارشاد ہوا ہے کہ ---اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بیشک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے۔ (الحجرات ۴۹)

اس سے معلوم ہوا کہ نسلی یا گروہی یا ملی بنیاد پر لوگوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ صرف پہچان کے لئے ہے۔ اس فرق کا کوئی بھی تعلق فلاح و نجات سے نہیں۔ فلاح و نجات کا معاملہ سراسر انفرادی ہے۔ کوئی شخص خواہ کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو، وہ اگر متقی ہے تو خدا کے یہاں اس کا درجہ ہے، ورنہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح صرف ایک انسان ہے۔ یہ معاملہ ایک اور آیت میں مزید واضح کیا گیا ہے۔ یہ البقرہ کی آیت نمبر ۶۲ ہے۔

اس آیت میں چار معروف مذہبی گروہوں کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کو بھی ان چار مذہبی گروہوں میں سے ایک مذہبی گروہ کی حیثیت دی گئی ہے۔ گویا کہ مذہبی گروہ یا مذہبی ملت ہونے کے اعتبار سے مسلمانوں کا معاملہ کچھ بھی دوسروں سے مختلف نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی گروہ (بشمول مسلمان) محض ایک خاص گروہ ہونے کی حیثیت سے فلاح و نجات کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

آیت کے مطابق خدا کے یہاں انعام کا استحقاق صرف ان افراد کے لئے ہے جو اللہ اور آخرت پر یقین کا ثبوت دیں اور اپنی زندگیوں میں عمل صالح کا طریقہ اختیار کریں۔ گویا نجات آخرت کا تعلق اس بات سے ہے کہ کسی فرد نے اپنے آپ کو کیسا بنایا، نہ یہ کہ وہ کس خاص گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔

سنت الٰہی

بنی اسرائیل (یہود) کے دور زوال کی تاریخ کا ایک واقعہ قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے تھی۔ جب وہ سبت (سنیچر) کے بارے میں تجاوز کرتے تھے۔ جب ان کے سبت کے دن ان کی مچھلیاں پانی کے اوپر آتیں اور جس دن سبت نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ ان کی آزمائش ہم نے اس طرح کی، اس لئے کہ وہ نافرمانی کر رہے تھے۔ (الاعراف۔ ۱۶۳)

اس آیت میں ایک خدائی قانون کو ایک تاریخی مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے، وہ قانون یہ ہے کہ کتاب خداوندی کی حامل قوم کو ابتداً آسان حالات میں دین پر عمل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ مگر جب وہ اس کی تعمیل نہ کرے تو حالات میں سختی پیدا کرنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ آسانی کے بعد مشکل، اور مشکل کے بعد مشکل تر، حتی کہ وہ وقت آجاتا ہے جب کہ دینی تقاضے پر عمل کرنا ہی حالات کے اعتبار سے اس کے لئے ممکن نہ رہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ تذکیر القرآن)

غور کیجئے تو موجودہ مسلم نسلوں کا معاملہ عالمی سطح پر ایسا ہی ہو رہا ہے۔ دعوت امت محمدی کی لازمی ذمہ داری ہے۔ یعنی خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام رحمت پہنچانا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے چونکہ یہ کام انجام نہیں دیا اس لئے ہر اگلے مرحلے میں اسی نسبت

سے ان کے لئے حالات سخت سے سخت تر ہوتے جارہے ہیں۔

اس معاملہ کی ایک نمائندہ مثال ہندستان ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کی لازمی ذمہ داری تھی کہ وہ اس ملک کے غیر مسلموں سے معتدل تعلقات قائم کرکے انھیں خدا کے دین رحمت سے باخبر کریں۔

اٹھارہویں صدی کے آخر تک مسلمان برصغیر میں حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے اس طرح انھیں یہ موقع حاصل تھا کہ وہ "الید العلیا" بن کر پوری آزادی کے ساتھ دعوت کا کام کرسکتے تھے مگر یہ مدت گزر گئی اور انھوں نے اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا۔

انیسویں صدی میں ہندستان میں انگریزوں کا سیاسی غلبہ ہوگیا۔ تاہم اب بھی دعوتی مواقع کسی قدر تبدیلی کے ساتھ موجود رہے۔ انگریزوں نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان توازن برقرار رکھا تھا۔ اس نے مسلمانان ہند کو یہ موقع دے دیا کہ وہ مساویانہ سطح پر برادران وطن کو دعوت پہنچائیں۔ مگر یہ موقع بھی انھوں نے کھودیا۔ اس موقع کو انھوں نے اس طرح برعکس طور پر استعمال کیا کہ غیر مسلموں سے مناظرہ بازی جیسے کام کرکے ان کو اسلام سے دور کردیا یہاں تک کہ یہ موقع بھی ختم ہوگیا۔

۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد ایک نیا دور آیا۔ اب سیکولرزم کے اصول کے تحت نیا دستور بنایا گیا۔ اس دور میں پہلا موقع تو ان کے لئے ختم ہوگیا۔ البتہ سیکولر دستور کے تحت انھیں ایک حقوق یافتہ اقلیت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ان کو دستور کی رو سے یہ حق دیا گیا کہ وہ جس مذہب کو چاہیں مانیں اور ملک میں پرامن طور پر جس مذہب کی چاہیں اشاعت کریں۔ مگر پچاس سال کی مدت گزر گئی اور وہ اس امکان کو استعمال کرنے میں بھی مکمل طور پر ناکام رہے۔

۱۹۹۸ سے ملک میں ایک نیا سیاسی دور شروع ہوا ہے۔ اس دور کے بارے میں تقریباً

یقینی ہے کہ یہ دور دعوتی اعتبار سے ان کے لئے مشکل ترین دور ہوگا۔ نئے ہندوستانی حکمراں دستور ہند میں مذہبی آزادی کی دفعہ (آرٹیکل ۲۵) کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔ اور ایسے قوانین بنائیں گے جن کے تحت دعوتی کام کرنا مشکل ہو جائے۔

یہ عین وہی سنت الٰہی ہے جو ہمارے حالات کے لحاظ سے ہمارے اوپر نافذ ہو رہی ہے۔ حاکمانہ حیثیت کے بعد مساویانہ حیثیت، مساویانہ حیثیت کے بعد حقوق یافتہ حیثیت، حقوق یافتہ حیثیت کے بعد دعوتی اعتبار سے بے حقوق حیثیت۔

بعد کی نسلیں

قرآن کی سورہ نمبر ے میں سابق اہل کتاب کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔ پھر ان کے پیچھے ناخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث بنے، وہ اسی دنیا کی متاع لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یقیناً بخش دیئے جائیں گے۔ اور اگر ایسی ہی متاع ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیں گے۔ کیا ان سے کتاب میں اس کا عہد نہیں لیا گیا ہے کہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہیں۔ اور انھوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لئے کیا تم سمجھتے نہیں۔ (الاعراف۔ ۱۶۹)

کسی امت کو جب خدا کی کتاب ملتی ہے تو اس کی پہلی نسل کے لوگوں کے لئے اس کی حیثیت ایک عہد نامہ کی ہوتی ہے۔ وہ اس کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ لیتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک خدائی گائڈ بک ہے اور اس لئے ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالیں۔ وہ اس کو اپنے حق میں ایک سنگین عہد و پیمان کا معاملہ سمجھتے ہیں۔

مگر امت کی اگلی نسلوں میں یہ شعور زندہ حالت میں باقی نہیں رہتا۔ خدا کی کتاب ان کے بعد کے لوگوں کو بطور وراثت ملتی ہے، وہ ان کے لئے ذاتی دریافت کے ہم معنی نہیں

ہوتی۔ جب یہ مرحلہ آتا ہے تو امت کے لوگ ایمانی گراوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اس گراوٹ کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کے عمل کا نشانہ بدل جاتا ہے۔ ابتدائی نسلوں میں دین اگر ان کا نشانۂ عمل تھا تو بعد کی نسلوں میں دنیا ان کا نشانۂ عمل بن جاتی ہے۔

رسمی اور ظاہری اعتبار سے دین اب بھی ان کے یہاں دکھائی دیتا ہے مگر حقیقی اسپرٹ کے اعتبار سے وہ ان کے درمیان موجود نہیں ہوتا۔ اب ان کی عملی زندگی پوری طرح دنیا طلبی کے راستہ پر چل پڑتی ہے۔ مادی ترقی ان کا اصل مقصود بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ظاہری پہلوؤں کو ہٹا کر دیکھا جائے تو ان میں اور دوسری قوموں میں کوئی حقیقی فرق باقی نہیں رہتا۔

اس غیر دینی روش کو ہمہ تن اختیار کرنے کے باوجود وہ اپنی آخرت کی کامیابی کے معاملے میں پوری طرح مطمئن رہتے ہیں۔ اس اطمینان کا راز ان کا یہ خود ساختہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ہمارا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے۔ ہم ہر حال میں بخش دیئے جائیں گے۔ ہمارے پیغمبر اور ہمارے بزرگ ہر حال میں ہم کو آخرت کے عذاب سے بچالیں گے۔

اس قسم کا عقیدہ سراسر فریب ہے۔ قرآن کے مطابق وہ کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں اس قسم کا خود ساختہ عقیدہ نہ پچھلی امت کے لوگوں کے لئے کار آمد ہو سکتا ہے اور نہ بعد کی امت کے لوگوں کے لئے۔

اکابر پرستی

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں دور زوال کے اہل کتاب کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار اور اپنے رہبان کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا (التوبہ۔ ۳۱)

اس آیت میں اہل کتاب کی اس گمراہی کی نشاندہی کی گئی ہے کہ انھوں نے اپنے علماء

اور مشائخ کو رب کا درجہ دے دیا تھا۔ رب بنانے سے کیا مراد ہے۔ اس کی وضاحت ایک روایت سے ہوتی ہے۔ عدی ابن حاتم جو عہد جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے۔ آپ نے مذکورہ آیت انھیں سنائی۔ اس کو سن کر عدی بن حاتم نے کہا کہ اے خدا کے رسول انھوں نے اپنے احبار و رھبان کی عبادت تو نہیں کی تھی۔ آپ نے جواب دیا ہاں، ان کے احبار اور رہبان نے ان پر حلال کو حرام کیا اور حرام کو حلال کیا تو انھوں نے ان کی پیروی کی یہی ان کی طرف سے ان کی عبادت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر۔ ۲/۳۴۸)

دور زوال میں کسی امت میں جو سب سے بڑی کمی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کا عقیدہ معرفت پر مبنی نہ ہو کر تقلید پر قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے افراد غیر محسوس خدا کی بڑائی میں نہیں جیتے بلکہ محسوس خداؤں کی بڑائی میں گم رہتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب کہ امت اس خرابی میں مبتلا ہو جاتی ہے جس کا اوپر کی آیت میں ذکر ہوا۔

اس دور زوال میں امت اپنے قومی بڑوں کو وہ درجہ دے دیتی ہے جو صرف خدا کے لئے خاص ہے خدا کا مقام یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہے اس کو بلا بحث مان لیا جائے۔ زوال یافتہ امت اپنے قومی بڑوں کے معاملہ میں یہی کرتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بلا بحث ان کو تسلیم کر لیتی ہے۔ حتی کہ اگر کوئی مصلح ان قومی بڑوں کی کسی بات پر تنقید کرے تو یہ لوگ اس پر اسی طرح برہم ہو جائیں گے جس طرح خدا کے خلاف بات پر انھیں برہم ہونا چاہیے۔

مومن وہ ہے جو خداوند عالم کی بڑائی میں جئے۔ ایسے انسان کو خدا کے سوا ہر دوسری بڑائی چھوٹی نظر آتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کا دین رسمی عقیدہ پر قائم ہو، جنھوں نے خدا کو

اس کی عظمتوں کے ساتھ دریافت نہ کیا ہو وہ اپنے خود ساختہ اکابر کو بڑا سمجھ لیتے ہیں۔ وہ مخلوق کو وہ درجہ دے دیتے ہیں جو صرف خالق کے لئے خاص ہے۔

جب کسی قوم پر اس قسم کا زوال آتا ہے۔ تو اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کے لئے دین کا ماخذ بدل جاتا ہے۔ دین میں ماخذ کی حیثیت صرف خدا اور رسول کو حاصل ہے۔ مومن کو اپنا عقیدہ یا عمل براہ راست خدا سے اور اس کے رسول سے اخذ کرنا ہے۔ مگر جب کسی قوم پر مذکورہ قسم کا زوال آتا ہے تو اس کے یہاں دین کا ماخذ بدل جاتا ہے اب وہ اپنا دین اپنے علماء اور اپنے بزرگوں سے لینے لگتے ہیں۔ وہ اپنے مفروضہ اکابر کو وہ درجہ دے دیتے ہیں جو درجہ انھیں صرف خدا اور اس کے رسول کو دینا چاہیئے۔

پرستش ایک فطری جذبہ ہے۔ وہ ہر انسان کی داخلی شخصیت میں آخری حد تک سرایت کیے ہوئے ہے۔ انسان خود اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی کو اپنی پرستش کا مرکز بنائے صاحب معرفت انسان ایک خدا کو پرستش کے اس جذبہ کا مرکز بناتا ہے۔ مگر جو لوگ معرفت سے خالی ہوں وہ ہر اس چیز کی پرستش کرنے لگتے ہیں جو بظاہر انہیں بڑی دکھائی دے۔

کتاب کو پس پشت ڈالنا

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں یہود کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ .... اور جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم خدا کی کتاب کو پوری طرح ظاہر کرو گے اور اس کو نہیں چھپاؤ گے۔ مگر اس کو انھوں نے پس پشت ڈالدیا اور اس کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا۔ کیسی بری چیز ہے جس کو وہ خرید رہے ہیں۔ (آل عمران۔۱۸۷)

خدا کی کتاب کی حقیقت ایک مقدس عہد نامہ کی ہے۔ خدا کی کتاب جب کسی قوم کو

دی جائے اور وہ قوم اس کتاب کو خدا کی کتاب کی حیثیت سے قبول کر لے تو ایسا کرنے کے بعد خدا اور اس قوم کے درمیان ایک پختہ عہد قائم ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے مطابق، اس قوم کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہوتا کہ وہ خود اس کی پیرو بن جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہوتا ہے کہ وہ قوم خدا کے بندوں کے سامنے اس کتاب کی نمائندگی کرے۔

اسی نمائندگی کا دوسرا نام دعوت ہے۔ دنیا کی قوموں کے سامنے خدا کے پیغام کو نہ پہنچانا گویا کتاب الٰہی کو چھپانا ہے۔ اور دنیا کی قوموں کو اس سے باخبر کرنے کا مطلب خدا کے دین کا اظہار کرنا ہے۔

خدا کی کتاب کا کتمان (اس سے لوگوں کو باخبر نہ کرنا) حامل کتاب گروہ کے لئے ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ کوئی بھی عذر اس فریضہ کو اس سے ساقط نہیں کرتا۔ مزید یہ کہ انسان چونکہ مرتے ہیں اور نئے لوگ پیدا ہوتے ہیں اس لئے اظہار دین یا دعوت حق کا یہ عمل ہر نسل میں جاری رکھنا ہے، اس کو بار بار دہراتے رہنا ہے تاکہ کوئی بھی نسل یا کوئی بھی پیدا ہونے والا انسان اس سے بے خبر نہ رہے۔

دعوت کا یہ کام سادہ طور پر صرف اعلان کا کام نہیں ہے بلکہ اس کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ انجام دینا ہے۔ مثلاً لوگوں کی قابل فہم زبان میں اس کو پیش کرنا، مدعو کی زیادتیوں کو یکطرفہ طور پر برداشت کرنا تاکہ دعوت کا معتدل ماحول باقی رہے، مدعو سے کسی بھی قسم کی مادی یا سیاسی کشمکش نہ کرنا تاکہ دعوت کی اخروی حیثیت مجروح نہ ہو۔ دعوت کے عمل کے ساتھ کسی بھی غیر دعوتی پہلو کو شامل نہ کرنا تاکہ اس کا خالص پن (purity) باقی رہے، وغیرہ۔

خدا کی کتاب کو کم قیمت پر بیچنے کا مطلب کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی

کتاب کو دنیوی مفادات کے تابع کر دیا جائے۔ دنیا کے کسی فائدہ کو لینے کی خاطر خدا کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ خدا کی کتاب کے نام پر خدا کی کتاب کا اس طرح استحصال کیا جائے کہ نام تو خدا کی کتاب کا لیا جائے مگر عملاً اس سے مادی فائدہ حاصل کرنا مقصود ہو۔

خدا کی کتاب کا حامل کوئی گروہ جب بھی اس کی تبلیغ واشاعت کا کام چھوڑتا ہے تو اس کا سبب ہمیشہ دنیوی اور مادی ہوتا ہے۔ حامل کتاب گروہ کے افراد پر اخروی فکر کا غلبہ ہو تو وہ لازماً اس کی تبلیغ واشاعت میں سرگرم ہوں گے۔ اس کے برعکس جب لوگوں کے اوپر دنیوی فکر کا غلبہ ہو جائے تو ان کے اندر سے وہ محرک یا داعیہ ختم ہو جاتا ہے جو انھیں تبلیغ واشاعت کے میدان میں سرگرم کرے۔

کتاب الٰہی کے حامل کسی گروہ پر جب اس قسم کا زوال آتا ہے تو اس کے فکری نتیجہ کے طور پر ایسے لوگوں میں خود غرضانہ نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس قسم کی نفسیات بلاشبہ دعوت کے لئے قاتل ہے۔ دعوت کا کام وہ لوگ کرتے ہیں جن کے اندر وسیع تر انسانیت کے لئے تڑپ موجود ہو گروہی عصبیت میں مبتلا لوگ دعوت کا کام نہیں کر سکتے۔

اسی طرح جو لوگ مذکورہ قسم کی گراوٹ کا شکار ہوں وہ مختلف قومی یا مادی اسباب کے تحت دوسری قوموں کو اپنا دشمن سمجھ لیتے ہیں۔ اس قسم کا جذبہ بلاشبہ دعوت کے کام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دعوت، اپنی حقیقت کے اعتبار سے دوسروں کے ساتھ محبت اور خیر خواہی کا معاملہ کرنا ہے۔ جس آدمی کے دل میں دوسروں کے لئے خیر خواہی نہ ہو وہ دوسروں کے اوپر دعوت و تبلیغ کا عمل بھی نہیں کر سکتا۔

کسی گروہ کو کتاب الٰہی کا حامل بنانا اس کو ایک مشن کا حامل بنانا ہے۔ کتاب الٰہی کا ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ اس کے حاملین اس کو اپنی زندگیوں میں اختیار کریں۔ اسی کے ساتھ

اس کا دوسرا لازمی تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے کتاب الٰہی کا اعلان واظہار کیا جائے۔ کتاب الٰہی کے پیغام سے لوگوں کو پوری طرح باخبر بنادیا جائے۔

مگر کتاب الٰہی کا حامل گروہ اپنی بعد کی نسلوں میں جب زوال کا شکار ہوتا ہے تو جس طرح اس سے دوسری مطلوب صفات گم ہوجاتی ہیں، اسی طرح یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کی تبیین و تبلیغ کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

کتاب الٰہی کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ حاملین کتاب کے اندر دوسروں کے لئے خیر خواہی موجود ہو۔ اور دور زوال میں ایسے لوگوں سے جو چیز سب سے زیادہ رخصت ہوجاتی ہے وہ یہی انسانی خیر خواہی ہے۔ اس کام کو درست طور پر صرف وہ لوگ انجام دے سکتے ہیں جن کے اندر یہ اخلاقی بلندی ہو کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں کو نظر انداز کر سکیں۔ مگر زوال یافتہ لوگوں میں یہ اخلاقی بلندی نہیں ہوتی اس لئے وہ کتاب الٰہی کی دعوتی ذمہ داریوں کو بھی پورا نہیں کرپاتے۔

کتاب الٰہی کی تبیین کا کام انتہائی نازک کام ہے۔ اس کو صرف ایسے افراد انجام دے سکتے ہیں جو انتہائی سنجیدہ اور باوصول ہوں۔ مگر زوال یافتہ لوگوں میں یہ دونوں صفات سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں۔ ان میں نہ سنجیدگی ہوتی ہے اور نہ اصول پسندی۔ یہی وجہ ہے کہ اس فرض کی ادائیگی میں وہ مکمل طور پر ناکام رہتے ہیں۔ دور زوال کا یہ مظہر پچھلے حاملین کتاب میں بھی دیکھا جاسکتا ہے اور بعد کے حاملین کتاب میں بھی۔

قول بلا فعل

قرآن کی سورہ نمبر ۶۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ ---اے ایمان والو تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں...... اللہ کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم

کرو نہیں۔ (الصّف ۲۔۳)

مسلمانوں میں جب ایمان کی کمزوری آتی ہے تو اس کمزوری کا اظہار ''قول'' کی سطح پر نہیں ہوتا بلکہ ''فعل'' کی سطح پر ہوتا ہے اب بھی لوگ اچھی اچھی باتیں بولتے ہیں، مگر وہ اپنی بات کے مطابق اچھے عمل نہیں کرتے۔ قرآن کے مطابق جن اچھے الفاظ کے ساتھ اچھا عمل شامل نہ ہو وہ آدمی کے لئے نہ کوئی قابل تعریف بات ہے نہ اس کو ایسی باتوں پر کوئی انعام ملنے والا ہے۔

مذکورہ آیت میں جس قول بلا فعل کا ذکر ہے وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی تقریروں میں جہاد اور اقدام کی باتیں کرے مگر وہ جہاد اور اقدام کی کارروائیوں میں عملی شرکت نہ کرے۔ اپنے الفاظ میں وہ اپنے آپ کو مجاہد ظاہر کرے مگر اپنے عمل کے اعتبار سے وہ صرف پیچھے رہنے والوں میں ہو۔ اپنی تقریر اور تحریر میں وہ عزیمت اور قربانی کا درس دے رہا ہو مگر حقیقی عمل کے اعتبار سے اس کا حال یہ ہو کہ اپنے ذاتی مفاد کے سوا کسی اور چیز سے اسے دلچسپی نہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو الفاظ کے اعتبار سے اپنے آپ کو اچھا انسان اور اچھا مسلمان ظاہر کریں مگر اپنی عملی زندگی کے اعتبار سے وہ صرف ایک سطحی اور خود غرض اور مفاد پرست انسان بنے ہوئے ہوں۔ خدا کی نظر میں ایسے لوگوں کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کی اچھی باتیں صرف ان کے جرم کو بڑھانے والی ہیں، وہ کسی بھی درجہ میں ان کو انعام کا مستحق بنانے والی نہیں۔

امام مالک اپنی مؤطا میں کہتے ہیں قاسم بن محمد تابعی جنھوں نے صحابہ کو دیکھا تھا، وہ صحابہ کے بارے میں کہتے تھے کہ میں نے ان لوگوں کو دیکھا ہے اور ان کا حال یہ تھا کہ وہ قول پر خوش اور متعجب نہیں ہوتے تھے۔ امام مالک اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں

کہ اس سے ان کی مراد عمل ہے۔ کیوں کہ آدمی کا عمل دیکھا جائے گا نہ کہ اس کا قول۔:

قال مالك وبلغني ان القاسم بن محمد كان يقول:ادركت الناس وما يعجبون بالقول.قال مالك يريد بذلك العمل انما ينظرإلى عمله ولا ينظر إلى قوله (موطا الامام مالك ٧٠٢)

صحابہ کرام دین کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ عمل ہے، خوشنما باتوں کی خدا کے یہاں کوئی اہمیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں جب تک صحابہ کرام کا غلبہ تھا، ایسے لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں ملی جو حقیقی عمل سے خالی ہوں، البتہ اچھی باتیں کر کے لوگوں کے درمیان عزت حاصل کئے ہوئے ہوں۔

مگر جب معاشرہ میں تقویٰ کی فضا باقی نہ رہے تو اسی قسم کے خوش کلام لوگ معاشرہ پر چھا جاتے ہیں وہ اپنے خوشنما الفاظ کے ذریعہ لوگوں میں عزت اور احترام کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ خدا کی نظر میں بے قیمت ہیں۔ آخرت میں ایسے لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم عزت اور شہرت کی صورت میں پچھلی دنیا ہی میں اپنی قیمت پا چکے، آخرت کی دنیا میں اب تمہیں کچھ ملنے والا نہیں۔

اشاعت فاحشہ

غزوہ بنو المصطلق کے ٦ھ کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ مدینہ کے کمزور مسلمانوں نے اس واقعہ کو ایک فتنہ کی شکل دے دی۔ اس کو لے کر انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ بدنام کرنے کی یہ مہم اتنی بڑھی کہ کچھ مخلص مسلمان بھی اس سے متاثر ہو گئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کی سورہ نمبر ۲۴ میں ارشاد ہوا ہے:

جن لوگوں نے یہ طوفان برپا کیا وہ تمہارے اندر ہی کی ایک جماعت ہے۔ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کے لئے وہ ہے جتنا اس نے گناہ کمایا۔ اور جس نے اس میں سب سے بڑا حصہ لیا اس کے لئے بڑا عذاب ہے۔ جب تم لوگوں نے اس کو سنا تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔ یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے۔ پس جب وہ گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ (النور ۱۱۔۱۲)

پیغمبر اسلام کے زمانے میں مدینہ میں بہت سے کمزور ایمان والے تھے۔ ان سے کوتاہیاں ظاہر ہوتی تھیں جن پر قرآن کی آیتیں اترتی تھیں، اس طرح کے واقعات بعد کے دور کے مسلمانوں کے لئے عبرت و نصیحت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی مسلم سماج میں کوئی شخص ایک بری خبر سنائے تو سننے والے ہرگز ایسا نہ کریں کہ وہ محض سن کر اس پر یقین کرلیں۔ ان کو اس معاملہ میں حسن ظن سے کام لینا چاہئے۔ خبر یا واقعہ کی کوئی اچھی توجیہہ کرنی چاہئیے تاکہ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بدگمانی کی فضا پیدا نہ ہو۔

بالفرض اگر اس خبر کو ماننا ہو تو ایسی صورت میں لازم ہے کہ سننے والے اس خبر کی تحقیق کریں۔ وہ خبر سنانے والے سے گواہی کا مطالبہ کریں۔ وہ اس سے کہیں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا باقاعدہ ثبوت پیش کرو۔ اگر وہ آدمی اپنی خبر کے حق میں باقاعدہ شرعی ثبوت پیش کرے تو اس کو مانا جائے ورنہ اس کو قطعی طور پر رد کردیا جائے۔

کسی شخص کے خلاف ایک بری بات سن کر اس کو دوسروں سے بیان کرنا ایک ناقابل

معافی جرم ہے۔ اس کو قرآن میں اشاعت فاحشہ کہا گیا ہے (النور۔۱۹) یعنی ایسی بات کا چرچا کرنا جو کسی شخص کو سماج میں بدنام کرنے والی ہو۔ زوال یافتہ سماج میں ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے بارے میں بری باتوں کو سننے سے بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ الزام اور حقیقی واقعہ میں فرق نہیں کرپاتے۔ ایک بے ثبوت الزام کو بھی وہ اسی طرح مان لیتے اور بیان کرتے ہیں جس طرح ثابت شدہ واقعہ کو۔ یہ کسی سماج کی بدترین حالت ہے ایسے لوگوں کے بارے میں سخت اندیشہ ہے کہ وہ خدا کے غضب کا شکار ہو جائیں۔

حامل کتاب

قرآن کی سورہ نمبر ۶۲ میں یہود کے بارے میں کہا گیا ہے کہ...... وہ لوگ جنھیں تورات کا حامل بنایا گیا پھر انھوں نے اس کو نہیں اٹھایا۔ ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کیا ہی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا (الجمعہ۔۵)

آسمانی کتاب کا حامل بننے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو اٹھانے والا اس کو انسان کی حیثیت سے اٹھائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو اس طرح اٹھایا جائے جیسے کوئی حیوان اپنی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ اٹھالیتا ہے۔ پہلی صورت میں یہ ہوگا کہ کتاب کو اٹھانے والا انسان اپنے ذہن اور قلب کے اعتبار سے اس کا حامل بنا ہوا ہوگا۔ وہ کتاب کی تعلیمات کو اپنی حقیقی زندگی میں اور اپنے قول و عمل میں شامل کئے ہوئے ہوگا۔

اس کے برعکس حیوان کی پیٹھ پر جب کوئی کتاب لادی جائے تو وہ صرف اس کے پیٹھ کے اوپر ہوگی وہ اس کے اندرونی وجود میں داخل نہیں ہوگی۔

.اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی امت جب اس حال میں ہو کہ خدا کی کتاب

اس کے دماغ میں اتری ہوئی ہو اور اس کی روح میں سرایت کئے ہوئے ہو تو ایسی حالت میں وہ حقیقی معنوں میں کتاب الٰہی کی حامل قرار پائے گی۔ لیکن جب امت زوال کا شکار ہوتی ہے تو اس کے افراد کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگیاں الگ ہوتی ہیں اور خدا کی کتاب الگ۔

مذکورہ دونوں حالتوں میں سے پہلی حالت خدا کی مطلوب حالت ہے، اور دوسری حالت خدا کی غیر مطلوب حالت۔ جب کسی امت میں یہ دکھائی دے کہ اس کے افراد کی زندگیاں کتاب الٰہی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں، تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ امت اپنے معیاری دور میں ہے۔ لیکن جب امت کے افراد کی زندگیاں کتاب الٰہی سے بے تعلق نظر آئیں تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ امت اپنے دور زوال میں پہنچ چکی ہے۔ ایسی قوم کے لئے کتاب الٰہی کا حامل ہونا، ایسا ہی ہے جیسے کسی حیوان کی پیٹھ کے اوپر کتابوں کا بوجھ لاد دیا جائے اور یہ حیوان اس سے اتنا زیادہ بے خبر ہو کہ اس کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس کی پیٹھ پر کیا چیز لادی ہوئی ہے۔

یہی بات قرآن کی سورہ نمبر ے میں اس طرح بیان ہوئی ہے --- پھر ان کے پیچھے ناخلف لوگ آئے جو کتاب کے وارث بنے، وہ اسی دنیا کی متاع لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یقیناً بخش دیئے جائیں گے۔ اور اگر ایسی ہی متاع ان کے سامنے پھر آئے تو وہ اس کو لے لیں گے۔ کیا ان سے کتاب میں اس کا عہد نہیں لیا گیا ہے کہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہیں۔ اور انھوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے۔ اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لئے، کیا تم سمجھتے نہیں۔ (الاعراف۔ ۱۶۹)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی کتاب سے وابستہ ہونے کی دو صورتیں ہیں

ایک وہ شخص ہے جو صاحب کتاب ہو، اور دوسرا شخص وہ ہے جس کو یہاں وارث کتاب کہا گیا ہے۔ خدا کی کتاب سے مطلوب وابستگی صرف وہ ہے جو پہلی قسم کی وابستگی ہو۔ دوسری قسم کی وابستگی کسی کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

صاحب کتاب وہ ہے جو خدا کی کتاب کو اپنے ذہن میں اتارے ہوئے ہو۔ خدا کی کتاب جس کے لئے زندگی کی رہنما بن جائے۔ وہ خدا کی کتاب کو اس طرح لے کہ اس کے تمام حقوق ادا کر رہا ہو۔

وارث کتاب وہ ہے جس نے خدا کی کتاب کو بذات خود شعوری طور پر دریافت نہ کیا ہو، بلکہ اس کو خدا کی کتاب نسلی وارثت کے طور پر مل جائے خدا کی کتاب اس کے گھر کا اثاثہ تو ہو مگر وہ اس کے ذہن کی روشنی اور اس کی روح کی زندگی نہ ہو۔

مذکورہ آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صاحب کتاب اور وارث کتاب کی الگ الگ پہچان کیا ہے۔ وہ پہچان یہ ہے کہ صاحب کتاب ایک متقی انسان ہوتا ہے اور وارث کتاب ایک غیر متقی انسان۔ جو آدمی حقیقی معنوں میں صاحب کتاب ہو اس کو خدا کی کتاب خدا سے ڈرنے والا بنادے گی۔ وہ ایک اندیشہ ناک زندگی گزارنے لگے گا۔ خدا کا خوف ہر لمحہ اس کی رگوں میں تیر تا رہے گا۔

اس کے برعکس جو آدمی وارث کتاب ہو اس کا حال یہ ہوگا کہ اس کی زندگی الگ ہو گی اور خدا کی کتاب الگ۔ خدا کی کتاب اس کے گھر کے طاق پر تو ضرور رکھی ہوئی ہوگی مگر وہ اس کے سینہ میں داخل نہیں ہوگی، وہ قلب وروح میں بجلی بن کر نہیں تیرے گی۔ اس کے اور خدا کی کتاب کے درمیان ایسا ہی تعلق ہوگا جیسے کوئی کتاب بستہ میں بند کر کے کسی کھونٹی پر لٹکا دی جائے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے سب سے زیادہ جس چیز کا ڈر ہے وہ خواہش اور لمبی آرزو ہے۔ پس خواہش حق سے روکتی ہے اور لمبی آرزو آخرت کو بھلادیتی ہے (ان اخوف ما اتخوف علی امتی الھوی وطول الامل فاما الھو ی فیصدعن الحق واما طول الامل فینسی الاخرۃ)مشکاۃ المصابیح ۱۴۳۸/۳

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:ان لکل امۃ فتنۃ وفتنۃ امتی المال (المشکاۃ المصابیح ۱۴۳۴/۳) یعنی ہر امت کا ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ خواہشوں اور آرزوؤں میں جینا یا مال کا طالب بننا ایسے فتنے ہیں جن میں ہر زمانہ کے لوگ مبتلا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ان چیزوں کو اپنی امت کا فتنہ بتایا اور خصوصی طور پر امت کو ان سے آگاہ کیا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ امت مسلمہ کا زمانہ آخری زمانہ ہے، یعنی وہ زمانہ جب کہ جدید صنعتی انقلاب ظہور میں آیا۔ اس صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں لاکھوں نئی چیزیں وجود میں آئیں اس طرح موجودہ دنیا انسان کے لئے زیادہ حسین ہو گئی جیسی حسین وہ اس۔ سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ آج کا انسان جب اس نئی دنیا کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے اس کے اندر اس بات کی لامحدود خواہش پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرے تا کہ وہ جدید دنیا کی رونقوں کو زیادہ سے زیادہ اپنے گرد اکھٹا کر سکے۔

اس نئی صورت حال نے آدمی کی خواہشوں اور آرزوؤں کو بے پناہ حد تک بڑھادیا

ہے۔ان میں سے ہر خواہش یا ہر آرزو اپنی تکمیل کے لئے مال چاہتی ہے اس لئے ہر آدمی بس مال و دولت کے پیچھے دوڑ رہا ہے ہر آدمی بس کمانے والا جانور (حیوان کاسب) بن گیا ہے جدید پر کشش سامانوں کی کوئی حد نہیں، اس لئے مادی دنیا کی طرف انسان کی دوڑ کی بھی کوئی حد نہیں۔

اس نئے دور نے ساری صورت حال کو بدل ڈالا ہے۔۔۔ اخلاقی اور روحانی قدروں کی جگہ مادی قدروں کا غلبہ ہے۔ وقت کا بہترین استعمال صرف یہ ہے کہ اس کو دولت کمانے میں لگایا جائے۔ مقصدی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اس کی جگہ مکمل طور پر مفاد پرستانہ زندگی نے لے لی ہے۔ انسانی صلاحیتیں بازار کا مال بن گئی ہیں، ہر آدمی تیار رہتا ہے کہ جس دکان پر اس کی زیادہ قیمت لگے وہاں وہ اپنے آپ کو بیچ دے۔ انسانی تعلقات تمام تر دنیوی مفاد کے تابع ہو گئے ہیں۔ دنیوی اہمیت کی چیزیں آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز بن گئی ہیں۔ ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہر آدمی اتنی زیادہ دولت اکھٹا کرنا چاہتا ہے کہ اس کے بیٹوں اور پوتوں تک کے لئے پر تعیش زندگی یقینی ہو جائے۔

یہ ہے وہ ماحول جس میں آج کا انسان جی رہا ہے۔ امت مسلمہ بھی اپنا سفر طے کرتے ہوئے اسی نئے زمانہ میں پہنچنے والی تھی اس لئے رسول ﷺ نے پیشگی طور پر اپنی امت کو آگاہ فرمایا تا کہ امت جب نئے فتنوں سے بھرے ہوئے اس دور میں پہنچے تو وہ اس کے بارے میں اس حد تک باشعور ہو کہ اپنے آپ کو اس کی آلائشوں سے بچا سکے۔

آج امت مسلمہ اسی طوفانی فتنہ کے دور میں ہے۔ ہر مرد اور عورت، ہر جوان اور بوڑھا اس فتنہ کبریٰ کی زد میں ہے۔ دیہاتوں سے لے کر شہروں تک کوئی بھی اس سے بچا ہوا نہیں۔ مذکورہ حدیث کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ موجودہ زمانہ میں کسی مسلمان کو

جانچنے کا یہی سب سے زیادہ کھلا ہوا معیار ہے۔ جو مسلمان اس نئے مادی سیلاب میں ڈوبنے سے اپنے آپ کو بچالے وہ کامیاب ہوا، اور جو مسلمان اس مادی سیلاب میں غرق ہو جائے وہ ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو گیا۔

اضاعت صلاۃ

قرآن کی سورہ نمبر ۱۹ میں ارشاد ہوا ہے کہ ۔۔۔۔ پھر ان کے بعد ایسے نا خلف جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو کھو دیا اور وہ خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے۔ پس عنقریب وہ اپنی خرابی کو دیکھیں گے، البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیا تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی (مریم ۶۰۔۵۹)

اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد امت مسلمہ کے بعد کے زمانے کے لوگ ہیں، یا تو اس کے مفہوم اول کے طور پر، ورنہ اس کے مفہوم ثانی کے طور پر۔۔ بعد کی نسلوں میں جب امت پر زوال آئے گا تو اس کے ایک گروہ کا وہ حال ہو جائے گا جو اس آیت میں بیان ہوا ہے (**هم قوم من امة محمد** ﷺ **فی آخر الزمان**) تفسیر القرطبی ۱۱/ ۱۲۲

اس آیت میں اضاعت صلاۃ سے مراد ترک صلاۃ نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ سرے سے نماز پڑھنا چھوڑ دیں گے اور مسجدیں نمازیوں سے خالی ہو جائیں گی۔ ایسا نہ کسی سابقہ امت میں ہوا اور نہ امت محمد میں ایسا کبھی ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز کو ضائع کرنے سے مراد نماز کی روح کا ضائع ہونا ہے نہ کہ نماز کی شکل کا باقی نہ رہنا۔ (**ھی عدم القیام بحقوقھا**) القرطبی ۱۱/ ۱۲۲

یہ بات حدیث میں زیادہ واضح لفظوں میں آئی ہے۔ مسند احمد اور الترمذی (کتاب

العلم) میں روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ بعد کے زمانہ میں امت کا یہ حال ہو جائے گا کہ ان کی مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوئی ہوں گی مگر ان کی نمازیں خشوع سے خالی ہوں گی حتی کہ تم ان میں ایک بھی خاشع آدمی نہیں دیکھو گے (فلاتری فیہ رجلا خاشعا)

دور زوال میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ نماز کی شکل باقی رہتی ہے مگر نماز کی روح غائب ہو جاتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اس کا سبب اتباع شہوات ہے۔ اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کی خواہشیں ان کے اوپر غالب آجاتی ہیں۔ وہ دنیوی اور مادی مفاد کو اولین اہمیت دے دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نماز کے فارم کو اس کی اسپرٹ سے الگ کر دیتے ہیں۔ وہ اسپرٹ کو چھوڑ کر فارم کو اختیار کر لیتے ہیں۔

اتباع شہوات کی بنا پر ان کا مزاج یہ ہو جاتا ہے کہ ان کے مادی مفادات محفوظ رہیں اور اسی کے ساتھ وہ نمازی بھی بنے رہیں۔ یہ مقصد نماز کو باعتبار فارم لینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ نماز کو اگر اس کی اسپرٹ کے ساتھ لیا جائے تو وہ مادی مفادات کے لئے قاتل بن جائے گی لیکن جب نماز کو صرف اس کی شکل کے اعتبار سے لے لیا جائے تو بیک وقت دونوں فائدے حاصل ہو جاتے ہیں۔

اب یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ آدمی کے مفادات بھی محفوظ رہیں اور اسی کے ساتھ نمازی ہونے کا کریڈٹ بھی اس کو حاصل ہو جائے۔

اس آیت میں توبہ سے کیا مراد ہے۔ یہاں توبہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی اس غلطی پر متنبہ ہو کہ اس نے خدا کے دین میں ایک عظیم جسارت کی ہے۔ اس نے نماز کی اسپرٹ کو اس کے فارم سے الگ کر دیا ہے۔ اس انتباہ کے بعد وہ اپنی غلطی کی اصلاح کرے یعنی نماز کے فارم کے ساتھ اس کی اسپرٹ کو بھی اس میں شامل کرے۔ وہ اس کامل نماز کا

نمازی بن جائے جس کو قرآن میں صلاۃ خشوع (المومنون۔ ۲) کہا گیا ہے۔

جب وہ ایسا کرے گا تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوگا کہ نماز کے ساتھ اتباع شہوات کا جمع ہونا ناممکن ہو جائے گا۔ نماز اگر اسپرٹ کے بغیر ہو تو ایسی نماز کسی آدمی کے لئے برائیوں کے خلاف چک نہیں بنتی مگر جو نماز اسپرٹ کے ساتھ ہو وہ عین اپنے مزاج کے مطابق برائیوں سے روکنے والی بن جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے کہ "ان الصلاۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر" (العنکبوت)

تحاکم الی الطاغوت

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں ارشاد ہوا ہے ـــــ اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اصحاب امر کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ بات اچھی ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوی کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ہے تم سے پہلے، وہ چاہتے ہیں کہ اپنا قضیہ لے جائیں طاغوت کی طرف، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر بہت دور ڈال دے (۵۹۔۶۰)

یہ آیت مدینہ کے ابتدائی دور میں اتری۔ اس وقت مشترک سماج قائم تھا۔ چنانچہ لوگوں کے لئے اپنے معاملات کا فیصلہ لینے کی دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہاں کے یہودی عالم کعب بن اشرف کے پاس جا کر اس کے سامنے اپنا معاملہ بیان کیا جائے اور اس سے فیصلہ لیا جائے۔ یہودی علماء سے فیصلہ لینے کی یہ روایت صدیوں سے مدینہ میں چلی آرہی تھی۔

دوسرا یہ کہ معاملہ کے دونوں فریق رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور آپ سے اپنے معاملہ کا فیصلہ کرائیں رسول اللہ ﷺ معاملات کا فیصلہ خدائی شریعت کے مطابق کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں کعب بن اشرف خدائی شریعت کا پابند نہ تھا۔ اس کے یہاں یہ امید ہوتی تھی کہ کوئی لفظی یا عملی تدبیر کر کے غلط طور پر اپنے حق میں فیصلہ لے لیا جائے۔

مدینہ کے مخلص مسلمانوں کے درمیان جب بھی کوئی نزاع پیدا ہوتی تو وہ ہمیشہ اس کو لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے۔ ان لوگوں کے پیش نظر یہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرلیں۔ بلکہ ان کا جذبہ یہ ہوتا تھا کہ زیر بحث معاملہ میں خدائی شریعت کا جو حکم ہے اس کو معلوم کریں اور پھر اس کو پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرلیں۔

تاہم مدینہ میں کچھ غیر مخلص اور مفاد پرست مسلمان بھی تھے جن کو منافق کہا جاتا ہے۔ غیر مخلص یا منافق مسلمان زیادہ تر وہ لوگ تھے جو یہودی قبائل سے نکل کر مسلمان ہوئے تھے۔ اس زمانہ کے یہودی چونکہ اپنے دور زوال میں تھے ان میں ہر قسم کی اخلاقی کمزوریاں آچکی تھیں۔ اس لئے جو لوگ ان یہودی نسلوں سے نکل کر اسلام میں آئے وہ اپنی قومی کمزوریاں بھی اپنے ساتھ لائے۔ انھوں نے اسلام تو قبول کرلیا تھا مگر اخلاقی اعتبار سے وہ انھیں کمزوریوں کا شکار تھے جو اس زمانہ کے یہودیوں میں عام طور پر پائی جارہی تھیں۔

مذکورہ قسم کے کمزور ایمان والے مسلمانوں سے جب کسی شخص کی نزاع پیش آتی تو وہ اپنے مفاد پرستانہ مزاج کے تحت یہ چاہنے لگتا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے موافق فیصلہ حاصل کرے۔ چونکہ اس طرح کا ناحق فیصلہ رسول اللہ ﷺ سے نہیں مل سکتا تھا اس لئے

وہ اپنا مقدمہ لے کر کعب ابن اشرف کے پاس جاتے، کیونکہ ان کو امید ہوتی تھی کہ اس یہودی عالم کے یہاں سے وہ اپنے موافق فیصلہ لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مذکورہ آیت میں اس قسم کے غیر مخلص مسلمانوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے۔ کہا گیا ہے کہ تم اپنے معاملہ کا فیصلہ لینے کے لئے طاغوت (یہودی عالم) کے یہاں جاتے ہو۔ صرف اس لئے کہ اپنی خواہش کے مطابق وہاں سے فیصلہ حاصل کرو مگر اس قسم کا فعل خدا کی نظر میں سخت گناہ ہے۔ یہ شیطان کی پیروی ہے نہ کہ حق کی پیروی۔

جو چیز شرعی طور پر آپ کا حق نہ ہو اس کو غیر شرعی ذریعہ سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا ایک جرم ہے۔ مزید یہ کہ غیر شرعی ذریعہ سے ایسی چیز کسی کو مل جائے تب بھی وہ اس کی نہیں ہوگی۔ پھر بھی خدا کی نظر میں وہ غاصب قرار پائے گا۔ اور آخرت میں سخت سزا کا مستحق ہوگا۔

قساوت قلب

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ کسی مسلم قوم پر جب لمبی مدت گذر جائے تو اس کے افراد کے دلوں میں قساوت پیدا ہو جاتی ہے۔ (الحدید۔ ۱۶) اس قساوت کو قرآن میں دل کا مرض بتایا گیا ہے (الحج۔ ۵۳) یہ قساوت بڑھتے بڑھتے اس نوبت کو پہنچ جاتی ہے کہ لوگوں کے دل پتھر کی طرح غیر اثر پزیر ہو جاتے ہیں (البقرہ۔ ۷۴)

جن لوگوں کے دلوں میں یہ قساوت آجائے وہ نہایت آسانی سے شیطان کی تزئین کا شکار ہو جاتے ہیں (الانعام۔ ۴۳) قساوت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے سینے میں خدا کی یاد والی کیفیات کا پیدا ہونا ختم ہو جاتا ہے (الزمر۔۲۲) قساوت کا آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی خدا کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس کو قرآن میں لعنت کہا

گیا ہے۔(المائدہ۔۱۳)

امام مالک نے اپنی موطا میں ایک حدیث نقل کی ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ جس دل کے اندر قساوت ہو وہ اللہ سے بہت دور ہو جاتا ہے۔(**فان القلب القاسی بعید من الله**)**موطا الامام مالک ۶۹۸**۔

قساوت کا مطلب ہے سخت ہونا۔کہا جاتا ہے: حجر قاس۔یعنی سخت پتھر۔اسی طرح کہا جاتا ہے:ارض قاسیۃ: یعنی بنجر زمین۔ سختی کی یہی صفت جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کو قلب قاسی کہا جائے گا۔یعنی بے حس قلب،ایسا دل جس کے اندر سے حساسیت رخصت ہو گئی ہو،جس کا حال یہ ہو جائے کہ وہ برائی کرے تو اس کی شناعت پر اس کا دل نہ تڑپے۔گناہ کا احساس اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر نہ نکلے۔

اسی کا نام قساوت یا بے حسی ہے۔یہ قساوت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔قساوت کا نقصان یہ ہے کہ اس کے بعد آدمی کے اندر سے ایمانی حساسیت ختم ہو جاتی ہے۔بے حسی کا مطلب ہے دل کا مر جانا،اور حساسیت کا مطلب ہے دل کا زندہ رہنا۔جن لوگوں کے دل زندہ ہوں انھیں کے اوپر خدا کا فیضان اترتا ہے۔انھیں فرشتوں کی صحبت نصیب ہوتی ہے۔دل کی یہ زندگی اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ان کو خدا کے پسندیدہ اعمال کی توفیق ملتی رہے۔ان کی روحانی ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہے یہاں تک کہ ان کی شخصیت وہ ربانی شخصیت بن جائے جس کو آخرت میں خدا کا پڑوس ملے گا،جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

اس کے برعکس جن لوگوں کے دلوں میں قساوت آجائے وہ اندر سے ایک مردہ انسان کی مانند ہو جاتے ہیں۔ان کے اندر وہ صلاحیت ختم ہو جاتی ہے جو انھیں خدا سے قریب کرے،جو انھیں فرشتوں کا ہم نشیں بنائے۔ایسے لوگوں کا دل اس طرح سخت ہو جاتا

ہے کہ وہ کسی تڑپانے والی بات پر نہ تڑپے۔ ان کی آنکھیں اس طرح خشک ہو جاتی ہیں کہ وہ آنسوؤں کا دریا بہانے والی بات پر بھی آنسو نہ بہائیں۔

حساس آدمی کو جب شیطان بہکاتا ہے تو وہ اپنی حساسیت کی بنا پر فوراً اس سے باخبر ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کی طرف رجوع کر کے اسی وقت اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ بے حس ہو جائیں، شیطان نہایت آسانی کے ساتھ ان کو بہکانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کو تباہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بتایا گیا ہے: جو لوگ ڈر رکھتے ہیں، جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کمی نہیں کرتے (الاعراف۔ ۲۰۲۔ ۲۰۱)

اب سوال یہ ہے کہ جو مرد یا عورت اپنے اندر قساوت یا بے حسی کی یہ بیماری پائیں وہ اپنی اصلاح کے لئے کیا کریں۔ اور کس طرح اپنے مردہ دل کو دوبارہ وہ دل بنائیں جس کے اندر زندگی اور حساسیت موجود ہو۔ اس سوال کا جواب ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

عن عبدا للہ بن عمر رضی اللہ عنہ :قال قال رسول اللہ ﷺ إن هذه القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد إذا اصابه الماء.قيل يا رسول الله وما جلاؤها قال كثر ة ذكر الموت وتلاوة القرآن.(مشكاة المصابيح الجزء الاول صفحه۔٦٢٦)

حضرت عبداللہ ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دلوں کو زنگ لگتا ہے جس طرح لوہے کو پانی کے اثر سے زنگ لگتا ہے۔ پوچھا گیا کہ اے خدا کے رسول اس کی جلا کیا ہے آپ نے فرمایا کہ موت کو بہت زیادہ یاد کرنا اور قرآن کی بہت زیادہ تلاوت کرنا۔

حدیث میں آیا ہے کہ موت کی یاد لذتوں کو ڈھادینے والی ہے (مشکاۃ المصابیح الجزء الاول ص ۵۰۴) انسان کے اندر جب بھی بے حسی آتی ہے تو وہ اس لئے آتی ہے کہ وہ ماڈی چیزوں میں لذت لینے لگتا ہے۔ وہ وقتی رونقوں میں گم ہو کر زیادہ اعلیٰ اور ابدی حقیقتوں کو بھول جاتا ہے۔ اس کمزوری کا سب سے زیادہ کارگر علاج موت کی یاد ہے۔ موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ کسی بھی لمحہ وہ موجودہ دنیا کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گا۔ کسی بھی لمحہ وہ وقت آجائے گا جب کہ اس کا رشتہ اس کی پسندیدہ چیزوں سے ٹوٹ جائے۔

اس طرح موت کا تصور آدمی کو ان چیزوں سے بے رغبت کر دیتا ہے جن میں پھنس کر وہ بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے موت آدمی کو متنبہ کرتی ہے کہ کسی بھی وقت وہ ایک ایسے بھونچال کی زد میں آسکتا ہے جس کو لوٹانے کی طاقت اس کے اندر نہیں۔ یہ احساس اگر کسی کو پوری شدت کے ساتھ ہو جائے تو وہ اس سے اتنا زیادہ ہل جائے گا کہ اس کا جمود ٹوٹ جائے اور اس کے سینہ میں حساسیت کا سوکھا ہوا چشمہ رواں ہو جائے۔

مردہ قلب کو از سر نو زندہ کرنے والی دوسری چیز قرآن کی تلاوت ہے۔ قرآن کیا ہے، وہ خدا کے جلال کا اظہار ہے وہ قیامت اور آخرت کے زلزلہ خیز واقعات کا بیان ہے، وہ جمود شکن الفاظ میں یہ بتاتا ہے کہ انسان کی کامیابی کس چیز میں ہے اور ناکامی کس چیز میں۔ قرآن ایک خدائی نصیحت نامہ ہے جو اپنے زلزلہ خیز انداز کی بنا پر قلب و دماغ کو ہلا دینے والا ہے۔

اس بنا پر جب کوئی شخص بار بار قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کی شخصیت ہل جاتی ہے۔ قرآن کا پر شکوہ انداز اس کو تڑپا دیتا ہے یہاں تک کہ بہت جلد ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سینہ میں دوبارہ ربانی کیفیات کا چشمہ ابل پڑے۔ خدا کی عظمتوں کا احساس اس کی آنکھوں سے آنسو کی شکل میں بہہ نکلے۔ اس کی بے حسی آخر کار حساسیت میں تبدیل ہو جائے۔

قانون فطرت

قرآن کی سورہ نمبر ۵۷ میں اہل اسلام کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ...... کیا ایمان والوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں اور اس حق کے آگے جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی۔ پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اس کی موت کے بعد، ہم نے تمہارے لئے نشانیاں بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو (الحدید ۱۶۔۱۷)

اس آیت میں یہود کی تاریخی مثال سے فطرت کے ایک قانون کو واضح کیا گیا ہے۔
اس دنیا کے فطری قوانین میں سے ایک قانون قانون زوال (degeneration) ہے۔ یعنی ابتدائی معیاری حالت کے بعد اس میں کمی واقع ہونا۔ یہود کی ابتدائی نسل نے جب پیغمبر کی دعوت کو قبول کیا تو یہ ان کے لئے ایک فکری انقلاب کے ہم معنی تھا۔ انھوں نے شعوری طور پر ایک دین کو چھوڑا اور شعوری طور پر دوسرے دین کو اختیار کیا۔ مگر ان کی بعد کی نسل کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ بعد کے لوگوں کو یہ دین وراثتی طور پر ملا تھا نہ کہ کسی شعوری فیصلہ کے تحت۔ اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کی ابتدائی نسل میں جو دینی صفات تھیں وہ ان کی بعد کی نسلوں میں باقی نہ رہیں۔

یہ ایک عمومی قانون ہے اور اس کا تعلق ہر امت سے ہے۔ چنانچہ یہی اندیشہ خود امت مسلمہ کے لئے بھی ہے۔ اس امت کے ابتدائی لوگ (اصحاب رسول) شعوری فیصلہ کے تحت اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے اندر اعلی ایمانی اوصاف پوری طرح موجود تھے مگر بعد کی نسلوں میں زوال آنا شروع ہوا یہاں تک کہ وہ اس نوبت کو پہنچ گیا جس

کا نمونہ آج ہر طرف نظر آتا ہے۔

زوال کے اس قانون سے بچنا کسی امت کے لئے ممکن نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جب امت کے افراد میں زوال آجائے تو ان میں احیاء نو (regeneration) کی تحریک چلائی جائے۔ یعنی ان کی کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے ان کے اندر نیا شعور جگانا۔ تذکیر ونصیحت کے ذریعہ ان کے اندر اصلاحی اسپرٹ پیدا کرنا۔ یہی حقیقت مذکورہ آیت میں زمین کی مثال سے بتائی گئی ہے۔ ایک زمین اگر مردہ ہو جائے یعنی وہ فصل اگانے کے قابل نہ رہے تو ایسی زمین کو دوبارہ زرخیز بنانے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمین میں دانا ڈالنے سے پہلے اس کو تیار کیا جائے۔ اس کے اندر سے کنکر پتھر کو نکالا جائے۔ جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کیا جائے۔ اس کی کھدائی کی جائے۔ اس میں کھاد ڈالی جائے۔ پانی سے سینچائی کر کے اس کو نرم بنایا جائے۔ اس طرح کے عمل کے بعد جب زمین تیار ہو جائے تو اس میں دانا ڈالا جائے۔ تیاری کے بغیر زمین میں دانا ڈالنا، دانے کو ضائع کرنا ہے۔ لیکن جب تیاری کے بعد زمین میں دانا ڈالا جاتا ہے تو وہ لہلہاتی ہوئی فصل میں بدل جاتا ہے۔

یہی معاملہ زوال یافتہ امت کا بھی ہے۔ ایسی امت کو دوبارہ اٹھانے کا کام اس طرح نہیں ہو سکتا کہ جوش دلا کر اس کو فوری طور پر حرکت میں لانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بجائے صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے افراد کو تیار کیا جائے۔

ایسی امت میں کام کا آغاز عملی پروگرام سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس میں کام کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ پہلے اس کے افراد میں ذہنی انقلاب لانے کی کوشش کی جائے یہاں تک کہ اسلام ان کے لئے از سر نو دریافت (rediscovery) بن جائے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر اسلامی عمل کی شاندار فصل اگائی جاسکے۔

ISLAMIC BOOKS

Books by Maulana Wahiduddin Khan

Islam and Peace	Rs. 150.00
Principles of Islam	145.00
The Quran for All Humanity	75.00
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	145.00
Woman in Islamic Shari'ah	80.00
Islam As It Is	55.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Religion and Science	45.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	10.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Qur'an: An Abiding Wonder	125.00
The Call of the Qur'an	95.00
No End to Possibilities	145.00
Introducing Islam	195.00

The Qur'an Tr. T.B. Irving	Rs. 295.00
The Koran Tr. M.H. Shakir	195.00
Heart of the Koran by Lex Hixon	195.00
The Moral Values of the Quran by Harun Yahya	125.00
The Essential Arabic by Rafi'el-Imad Faynan	200.00
Presenting the Qur'an by Saniyasnain Khan	125.00
The Wonderful Universe of Allah by Saniyasnain Khan	85.00
The Soul of the Qur'an by Saniyasnain Khan	145.00
Tell Me About Hajj by Saniyasnain Khan	295.00
The Muslim Prayer Encyclopaedia Ruqaiyyah Waris Maqsood	325.00
After Death, Life! Ruqaiyyah Waris Maqsood	195.00
Living Islam: Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
A Basic Dictionary of Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
The Muslim Marriage Guide Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
The Beautiful Commands of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	125.00
The Beautiful Promises of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	175.00
Muslim Travel Guide (Forthcoming) Ruqaiyyah Waris Maqsood	—
Muhammad: A Mercy to all the Nations by Q. A. Jairazbhoy	250.00
A-Z Steps to Leadership by Abdul Ghani Ahmed Barrie	95.00
The Sayings of Muhammad by Sir Abdullah Suhrwardy	75.00
The Life of the Prophet Muhammad by Mohd. Marmaduke Pickthall	75.00

Finest collection of books on Islam

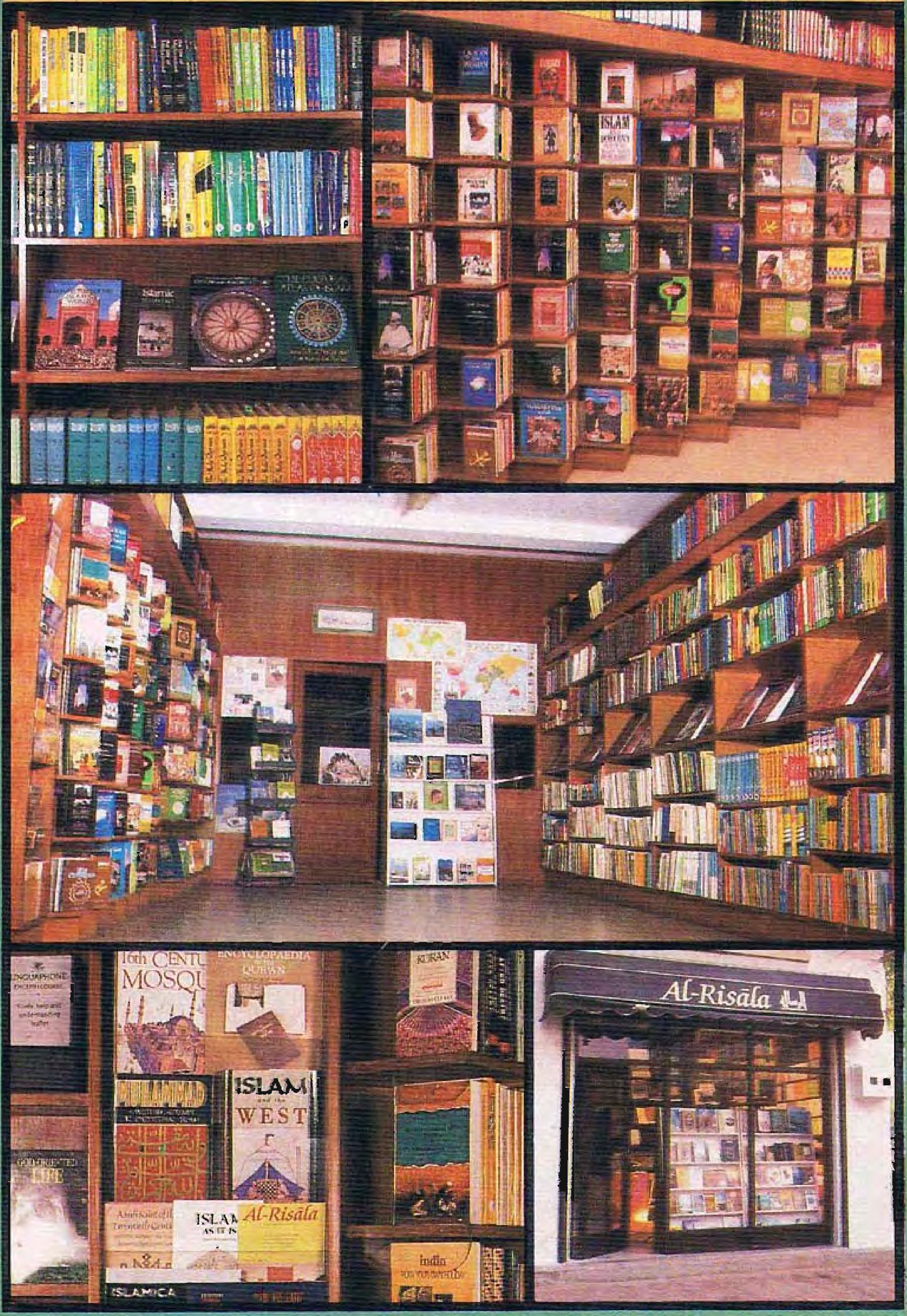

AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013
Tel. 4611128 Fax 4697333